Cut by sha

بازگشت

سیّد یوسف بخاری

مکتبہ جہاں نما دہلی

طبع اوّل (۱۹۴۴ء) ایک ہزار

مطبوعہ جمال پریس، دھلی
قیمت ڈیڑھ روپیہ

فہرست

والدہ ماجدہ کے نام

پیش لفظ

یہ تھوڑے ہی دن کی بات ہے کہ میں نے "یہ دِلّی ہے" کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس میں دِلّی کی پرانی معاشرت اور قدیم تہذیب کے متعلق کچھ ضروری باتیں تھیں۔

"بازگشت" اُس کا نقشِ ثانی ہے، نقشِ ثانی اِس لئے کہ اِس مجموعہ میں بھی دو مضامین" دِلّی کی مہرکنی اور دِلّی کی سادہ کاری" خاص طور پر ایسے ہیں جن کا تعلق دِلّی کی دو قدیم اور مشہور صنعتوں سے ہے جو آج بھی زندہ ہیں اور تاریخ میں اُن کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہے، باقی تمام مضامین ادبی ہیں اور زیادہ تر "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کے ترجمان جو ادب کے موجودہ ترقی پسند دَور کا مطمحِ نظر ہے۔

"ہندوستان کے متعلق بابر کی رائے" میں بابر کی مشہور و معروف اور ہردلعزیز کتاب" تزکِ بابری" سے مدد لی گئی ہے جس کا اب فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اور" ادبی چور" کا مرکزی خیال جنابِ بہار کوٹی کے مضمون "اِستفادہ" مطبوعہ رسالہ عالمگیر لاہور ماہ فروری (۱۹۳۴ء) کے مطالعہ اور اِستفادے کا نتیجہ ہے، اگرچہ دو تین مقامات پر اُنہی کی مثالوں اور خیالات کو میں نے اپنے 'ادبی چور' کا ترجمان بنایا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ 'ادبی چور' اِس مرتبہ ایک بالکل نئے روپ میں سامنے آیا ہے۔

یہ تمام مضامین اِس سے قبل آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے مختلف اوقات

میں نشر ہو چکے ہیں اور موجودہ کتابی صورت میں کافی ترمیم و ایزاد کے بعد جو ناگزیر تھی پیش کئے جا رہے ہیں۔

یہ مضامین کیسے ہیں؟ اہلِ نظر خود جانچ اور پرکھ لیں گے پھر بھی میں اتنا عرض کر دوں کہ نہ تو یہ ٹھوس اور خشک ہیں کہ فلسفہ اور منطق کی طرح اُن کے مطالعہ سے جی گھبرائے اور نہ پست اور عُریاں ہیں کہ مذاقِ سلیم پر بار ہوں، مجھے افسوس ہے کہ میرے بعض ہم عصروں نے عُریانی اور فحش نگاری کو اپنا طُرّہ امتیاز بنا رکھا ہے جسے وہ اپنی ترقی پسندی پر محمول کرتے ہیں۔

یوسف بخاری، دہلوی
۱۵ر جولائی ۴۴ء

اگر
ہارون رشید
آج زندہ ہوتے

الف لیلہ کے قصوں میں خلیفہ ہاروں رشید کا نام اِس قدر کثرت سے ملتا ہے گویا وہ کتاب الف لیلہ نہیں بلکہ داستان ہاروں رشید ہے جو مختلف کہانیوں کی صورت میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان کی گئی ہو۔ حالانکہ الف لیلہ کے اکثر افسانوں میں ہاروں رشید نے جو حصّہ لیا ہے وہ اُس کا بالکل ضمنی کردار ہے۔ بغداد کے گلی کوچوں میں ہاروں رشید کے پھرنے سے صرف دوسرے لوگوں کے قصوں کا پتہ لگتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں عربوں کی جو تمدنی اور معاشرتی حالت تھی کچھ اُس پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن خود ہاروں رشید جس کا ذکر الف لیلہ میں بار بار آیا ہے۔ کسی قصہ میں ہیرو کی حیثیت سے ہمارے سامنے نہیں آتا۔ اُس کی اصلی شخصیت بالکل پوشیدہ رہتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے الف لیلہ کی افسانوی دُنیا کا خیال چھوڑ کر ہاروں رشید کو اُس کے اصلی روپ میں دیکھیں۔

ہاروں رشید بغداد کے خلفائے عباسیہ میں سے پانچواں نامور خلیفہ ہے۔ تمام مورخوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ خلیفہ اپنے ظاہری کمالات اور باطنی خوبیوں میں

تمام خلفاء سے بڑھکر تھا۔ وہ اپنی وسیع سلطنت کا جو ہندوستان اور تاتار کی حدود سے بحر اوقیانوس کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی ایک خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ تھا، ایسا بادشاہ جس نے چوبیس برس تک اپنے عمدہ نظام حکومت، عدل وانصاف، فیاضی وسخاوت اور رحم وکرم کے ذریعے اپنی رعایا کے دلوں پر حکومت کی۔ وہ علم فصاحت اور بلاغت میں مشہور ہونے کے علاوہ علم دینی سے بھی مالامال تھا اور اِسی علم دینی کی بدولت وہ اپنے مذہبی فرائض اور عقائد کا عملاً جس قدر پابند اور معتقد تھا شاید ہی اُس زمانے کا کوئی دوسرا شخص ہو علوم وفنون کی جو قدر ومنزلت اُس کے زمانے میں ہوئی وہ کسی اور خلیفہ کے وقت میں نہیں ہوئی علماء، اُدباء، شعرا، مغنّی، قاضی، نجومی، مجوس اور طبیب سب ہی اُس کے درباری تھے۔ مغنیوں اور موسیقی والوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ اُس کے شاہانہ انعام واکرام کی بارش اکثر ان ہی شاعروں عالموں اور مذہبی پیشواؤں پر ہوتی تھی۔ خلیفہ کو اپنی رعایا کے آرام وآسائش کا اس قدر خیال تھا کہ اکثر راتوں کو وہ اپنی میٹھی نیند کھو کر اور بھیس بدل کر وزیر جعفر برمکی اور مسرور حبشی غلام کے ہمراہ اُن کی خبر گیری اور حال معلوم کرنے کے لئے بغداد کے گلی کوچوں میں پھرا کرتا تھا۔ کوچہ وبازار کی اِس گردش نے اُس کے عدل وانصاف اور سخاوت کو گھر گھر پھونک دیا۔ دور دور تک اُس کی شہرت اور ناموری کا ڈنکا بجنے لگا۔ لوگ اُس کی زندگی میں حاضر وغائب اس کی تعریف کرتے تھے اور آج بھی وہ تاریخوں اور داستانوں میں اُسی طرح مشہور ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

لیکن اگر وہ آج سچ مچ ہمارے درمیان زندہ ہوتا! اگر نیوٹن کو بھینچنے کے آلات مل جاتے تو وہ تمام روئے زمین کو بھینچ کر ایک مکعب فٹ بنا دیتا

اگر فیثاغورث کو لیور قائم کرنے کی جگہ مل جاتی تو وہ تمام زمین کو اُس پر اٹھا لیتا غرض اِسی حرفِ شرط سے چاہو تو آج ہاروں رشید کا زندہ ہونا بھی ممکن ہے لیکن کیا ہاروں رشید آج بھی وہی ہاروں رشید ہوتا جو کبھی اپنے عہدِ خلافت اور بادشاہت میں تھا۔

یہ قدرتی بات ہے کہ وقت اور زمانہ ہمیشہ اُدلتا بدلتا رہتا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ رسم و رواج اور قانون بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اِس لئے یہ خیال بھی درست ہو سکتا ہے کہ ہاروں اپنی فطرت کے اعتبار سے تو وہی ہاروں ہوتا کیونکہ فطرت کبھی نہیں بدلتی لیکن اپنے ظاہری فعل اور عمل کے لحاظ سے یقیناً وہ کچھ اور ہی ہوتا۔

خلافت کا دور ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا اِس لئے اِس بات کو تو بالکل یقینی سمجھئے کہ وہ اِس وقت ہرگز خلیفہ نہ ہوتا۔ اب باقی رہی اُس کی بادشاہت تو بہت ممکن ہے کہ وہ اِس وقت بادشاہ بھی نہ ہوتا کیونکہ فی زمانہ دنیا کے اکثر حصّوں میں موروثی بادشاہت کا دستور نہیں رہا۔ بادشاہوں کی مطلق العنانی اور خودمختاری مُشترکہ بادشاہت اور حکومت میں تبدیل ہو گئی ہے اور بفرضِ محال اگر وہ بادشاہ بھی ہوتا تب بھی میرا خیال ہے کہ اُس جیسی سرشت اور مزاج کے آدمی کو جمہوریت ہی کا قائل ہونا پڑتا۔ اگر بادشاہ نہ ہوتا تو چونکہ اُس کو بھیس بدل کر لوگوں کے حالات معلوم کرنے کا شوق تھا اِس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ شاید موجودہ زمانے میں ایک بین الاقوامی شہرت کا مالک جاسوس ہوتا جو اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ممالک کے واقعات اور وہاں کے لوگوں کے طرزِ عمل اور آئندہ کے ارادوں سے باخبر ہو کر اپنی حکومت کو اس طرح آگاہ کرتا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی۔

یا اپنی شب گردی کی عادت کی وجہ سے وہ اپنے لئے صحافت کا پیشہ انتخاب

کرتا اور اُس جیسا صاحب نظر اور صائب الرائے صحافی صحافت ہی پر ختم نہ ہو جاتا بلکہ اگر کسی جمہوری ملک میں ہوتا تو کسی دن ایسے عہدے پر پہنچتا۔ جہاں اُس کو رہنمائی کرنے کا موقعہ ملتا۔ ہمارے زمانے میں ایسے صحافیوں کی مثال موجود ہے۔ جنہوں نے اپنے علم و آگاہی کے باعث اِس قسم کی ترقی حاصل کی۔ برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر چرچل اور وزیر ہند مسٹر ایمرے انہی لوگوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے صحافی کی حیثیت ہی سے زندگی کی ابتدا کی تھی۔ ہاروں رشید کو بھی فصاحت و بلاغت کا وہ نادر جوہر ملا تھا۔ جس نے آج کل کے اِن رہنماؤں کو اپنے زمانے میں امتیاز بخشا۔

ہاروں رشید ایک اعلیٰ درجے کا شاعر اور ادیب بھی تھا۔ الف لیلہ میں اُس کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اُس سے برگشتہ ہو کر یا شاید وقت کی نزاکت اور زمانے کی ضروریات کا احساس کر کے وہ ایک ایسے ادب کی بنیاد رکھتا جو ہماری زندگی کے حقائق سے بہت قریب ہوتا، مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ہاروں رشید اگر ہمارے زمانے میں ہوتا تو وہ فن برائے فن کے نظریہ کا سخت ترین دشمن ہوتا اور اُس کی بجائے فن برائے زندگی کے نئے تصوّر کی حمایت میں سرگرمی کا اظہار کرتا کیونکہ یہی نظریہ ہمارے موجودہ ترقی پسند ادب کا خالق ہے اور اس نے ہمارے ادب میں تہذیب و تمدن کی پوشیدہ بیماریوں اور ملکوں کے سیاسی و اقتصادی نظاموں کی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہاروں رشید اس موہوم ادب اور اس رومانی شاعری کی بیخ کنی کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتا جس کا نقطۂ آغاز الف لیلہ تھی

ہاروں نے بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارہ مختلف ملکوں اور قوموں کے عالموں اور فاضلوں کا اس لیے قائم کر رکھا تھا کہ وہ مختلف زبانوں کے علوم و فنون کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کریں، ہر علم کے متعلق اس کی ضروری معلومات

حاصل کرنے کے لئے پوری پوری تحقیق و تدقیق سے کام لیتا تھا۔ اس لئے آجکل اگر کہیں اقتدار کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں ہوتی تو اِس کا بھی امکان تھا کہ وہ مریخ بھیجنے کے لئے ایک نئی مُہم تیار کرتا جو آج کل کے انجینیر وں اور سائینس دانوں پر مشتمل ہوتی۔

آیئے اب اُس مقتدر اور نامور شہنشاہ سے ملاقات کیجئے جو اپنے وقت میں کیا کچھ تھا اور جسے ہم نے آج زندہ فرض کر کے آپ کے سامنے پیش کرنے کا یہ اہتمام کیا ہے، اِس وقت ایک ہندوستانی سیاح کو ایک دعوت میں ہاروں رشید سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہے۔

"آپ کون ہیں اور آپ کا بغداد کیسے آنا ہوا؟"

"امیر المومنین! میں ایک ہندوستانی سیاح ہوں، مجھے حسن کہتے ہیں، سیر و سیاحت میرا شوق اور تجارت میرا پیشہ ہے، اس شہر میں بالکل نو وارد ہوں۔ کل شام میں ایک جوہری کی دوکان پر جواہرات دیکھنے اور اُن کی خرید و فروخت میں مشغول تھا۔ جب اس کام سے فراغت پائی تو وہ جوہری بسبب ہم پیشہ ہونے کے بہت محبت سے پیش آیا اور نہایت عاجزی اور خوشامد سے مجھے اپنے گھر لے گیا اور اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا، پھر قہوہ پلایا اور رات گئے تک ناچ و رنگ کی محفل قائم رکھی۔ اِسی دوران میں تین مسافروں کے آنے کی اطلاع ہوئی، عربوں کا جو اصولِ مہمان نوازی ہے اُس کے مطابق جوہری نے اُن کو بھی خوش آمدید کہا۔ اور خوب خاطر و تواضع کی، جب آدھی سے زیادہ رات ہوئی تو یکایک مکان کی ساری روشنی گُل ہو گئی، چور چور کا غل برپا ہوا اور چند حبشیوں نے آ کر اہل محفل کو مارنا اور لوٹنا شروع کیا۔ امیر المومنین میں اِس صدمے کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ صاحب خانہ اور اُن

تینوں مسافروں پر کیا بیتی لیکن جب صبح ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ایک عالیشان مکان میں پایا خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے؟"

"تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟"

"امیر المومنین یہ تو وہ ہی شریف جوہری ہے جس نے کل رات میری دعوت کی تھی اور میرے ساتھ اس آفت میں مبتلا تھا"

"تم کو نہیں معلوم، ہم اپنی عادت کے مطابق کل مسافروں کے بھیس میں تھے اور اول سے آخر تک جو واقعات تم کو پیش آئے ہم نے اُن سب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اِس شخص نے عربوں کی مہمان نوازی کو بدنام کیا ہے اب یہ کل اپنے اعمال کی سزا پائے گا۔ مطمئن رہو تمہارے جواہرات ہمارے پاس محفوظ ہیں"

"امیر المومنین۔ میں نے لوگوں کی زبانی جو کچھ سنا اور کتابوں میں جس قدر پڑھا تھا۔ آج وہ ہو بہو میرے تجربے میں آیا۔ میں اِس الطافِ شاہی اور مہربانی کا کیوں کر شکریہ ادا کروں"

"حسن۔ تم ہمارے ابو معاویہ سے تعارف حاصل کرو، یہ نابینا عالم ہیں۔ لیکن ہم سب سے زیادہ دیکھتے ہیں"

"امیر المومنین نے بالکل سچ فرمایا، انسان بظاہر اندھا ہو تو کوئی نقصان نہیں بشرطیکہ اُس کی چشمِ قلب روشن ہو۔ لیکن شاہ ذی شان تو خود اُن کے ہاتھ دھلا رہے ہیں، میں اِس راز کو بالکل نہیں سمجھا"

"اے شخص اِس میں راز کچھ بھی نہیں مجھکو صرف علم و فضل کا پاس اور لحاظ ہے اور اِس لیئے میں عالموں اور فلسفیوں کا ادب اور اُن کی قدردانی کیا کرتا ہوں شاعر، مغنی اور موسیقی داں بھی اپنے ہنر و فن کی وجہ سے انعام پاتے ہیں، کیا ہندوستان میں ادیبوں اور شاعروں کی عزت نہیں ہوتی"

"نہیں ہوتی تو ہے لیکن جتنا احترام آپ کی نگاہ میں ہے وہ ہماری نئی تہذیب میں نہیں"

"ہندوستانیوں کو اپنے مشاہیر کی پوری توقیر کرنی چاہیئے اس لئے کہ ادب اور اخلاق یہی انسانی شرافت کے اصل جوہر ہیں، اچھا تم کھانے کے بعد کیا پیا کرتے ہو"

"جو خداوندِ نعمت عطا فرمائیں کیا قہوہ سے بھی زیادہ کوئی اور عمدہ چیز ہو سکتی ہے"

"کیوں نہیں! حسن ایک جام تو پی کر دیکھو"

"کیا امیر المومنین کے نزدیک اِس کا پینا جائز ہے؟"

"یقیناً"

"آپ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین ہیں آپ کی کوئی بات بغیر شرعی دلیل کے نہیں ہو سکتی"

"بیشک"

"لیکن شراب تو قطعی حرام ہے"

"افسوس تم نے اِسے عام شراب سمجھا جو نشہ کرتی ہے، یہ تو بنیذ ہے، کھجور کا تازہ عرق جسے تمہارے ملک کی زبان میں تاڑی کہتے ہیں، اِس میں نشہ کہاں اِسی لئے تو تمام علماء عراق نے اس کو جائز قرار دیا ہے"

"امیر المومنین تب تو میں اسے ضرور پیونگا۔ یہ حقیقت مجھ پر آج روشن ہوئی کہ حضور اس شراب سے اتنا ہی دور ہیں، جتنا اور گناہوں سے ہے، کچھ عجب نہیں کہ وہ تمام قصے بھی غلط ہوں جو الف لیلہ میں امیر المومنین کے متعلق لکھے گئے ہیں"

"تمہارا مقصد کہیں اُس کتاب سے تو نہیں جس میں تین سیب یا زنِ مقتولہ۔ نور الدین اور انیس الجلیس۔ سوتے جاگتے کا قصہ۔ انگشت بُریدہ نوجوان اور زبیدہ خاتون۔ ابوالحسن اور شمس النہار اور تین کانے قلندروں وغیرہ کے قصّے درج ہیں، اور اُن میں جا بجا عورت، شراب اور موسیقی کا ذکر آیا ہے، کہیں سحر اور جادو ہے اور کہیں جنون، دیووں اور پریوں کا عمل اور دخل ہے کہ پڑھ کر کبھی غصہ آتا ہے اور کبھی بے اختیار ہنسی، غالباً شاہی کتب خانے اس کا ایک نسخہ موجود ہے"

"لیکن یہ قصے امیر المومنین سے کیوں کر منسوب ہو گئے"

"بات یہ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ لکھتے وقت ایسی بے شمار حکائیتیں جو اس زمانہ کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہوں اُس قوم کے کسی مشہور شخص سے اِس طرح منسوب ہو جاتی ہیں، جیسے وہی اُن کہانیوں کا ہیرو ہو اور کہانیوں کے تمام واقعات خود اُسی کے حالات زندگی ہوں۔ عربی میں ایسی کہانیاں بکثرت موجود ہیں، جو مجھ سے منسوب ہیں۔ حالانکہ یہی کہانیاں کہ جن میں میرا یا میرے عہد کا ذکر آیا ہے کسی دوسرے بادشاہ اور اس کے زمانے سے بھی نہایت اچھی طرح منسوب کیجا سکتی تھیں"

"امیر المومنین نے الف لیلہ پر نہایت محققانہ انداز میں روشنی ڈالی لیکن جعفر و عباسہ کی شادی اور پھر عباسہ اور اُس کی اولاد کا قتل ہونا کیا یہ بھی غلط اور بے بنیاد ہے؟"

"ہاں بالکل غلط اور بے بنیاد" البتہ جعفر برمکی نے جو کبھی میری سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا خود اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کیا بعض وقت ایک بادشاہ اپنی جان اور سلطنت کی بقا کے لئے مجبوراً وہ کر گذرتا ہے جو ظاہر میں اُس کو نہ کرنا چاہیئے، عوام اگر بادشاہ کے اس فعل پر نکتہ چینی کریں تو کوئی مضائقہ

نہیں کیونکہ وہ رموزِ مملکت کو سمجھنے کے اہل نہیں، افسانہ نگار بھی اِس میں بے قصور ہیں کیونکہ کہانیاں اکثر وبیشتر جھوٹی ہی ہوتی ہیں لیکن وہ متعصب مورخین جو میری سلطنت کا عروج اور شان وشوکت دیکھکر حسد سے انگاروں پر لوٹتے تھے انھوں نے مجھ کو پیٹ بھر کر بدنام کیا اُن کے اِس جھوٹ ہی نے اُن کو اسقدر مشہور اور امیر بنا دیا ہے اور یہ لوگوں کی فطرت ہے کہ اگر بیان میں سادگی اختیار کی جائے تو وہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ سمجھتے ہیں"

"امیرالمومنین۔ آپ کو یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ اکثر ہندوستانی آپ کو ابتک الف لیلہ کا ایک فرضی بادشاہ تصوّر کرتے ہیں، میں خود اِسی مغالطہ میں تھا لیکن آج خلیفہ کی عنایت سے امیرالمومنین کی شخصیت پورے طور سے معلوم ہوگئی"

"حسن۔ ابھی تم نے جس نئی تہذیب کا ذکر کیا تھا کیا اُس میں کچھ آرٹ وغیرہ کو بھی دخل ہے؟"

"ہاں ہے بھی اور نہیں بھی یہ صرف دیکھنے والے کے زاویۂ نگاہ پر منحصر ہے جس طرح وہ دیکھے اور سمجھے۔"

"یہ تم نے غلط کہا۔ آرٹ کا مطالعہ تو آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے کیونکہ وہ اپنی ذاتی خوبیاں اپنے آرٹ میں منتقل کر دیتا ہے اور اِسی لیے وہ نقاد کے بنائے ہوئے اصولوں کی پابندی پر مجبور نہیں تاوقتیکہ وہ خود آرٹسٹ نہ ہو۔ اچھا آرٹ کے ہونے اور نہ ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"امیرالمومنین آرٹ کا وجود تو ہر جگہ ہے اور ایک مدت سے چلا آتا ہے لیکن آج کل تو لوگ گھوڑدوڑ، کشتی، شطرنج اور تاش کے جوئے تک آرٹ سمجھتے ہیں، اگر اُن کی پیروی میں اُن چیزوں کو اختیار کیا جائے تو لوگ اس کے نام اور حلیہ تک سے واقف ہو جاتے ہیں اگر وہ بچا رہے تو پھر اُس کو بے وقوف

اور گاؤدی سمجھتے ہیں"

"حسن۔ تم آرٹ کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے میں ذرا چوک گئے ہو آرٹ کا مطلب صرف یہ نہیں کہ صنعت و حرفت میں علم و حکمت سے پورا پورا کام لے کر اُس چیز کو بالکل عجیب یا غیر معمولی حسین اور خوبصورت پیش کیا جائے بلکہ...."

"قطع کلامی معاف میں تو یہی سمجھتا ہوں کیونکہ کسی چیز میں حُسن پیدا کرنے سے دل کو ایک راحت اور دماغ کو ایک مسرت ہوتی ہے اور یہی آرٹ کا مقصد ہے"

"میں آرٹ کے اس مقصد سے بھی منکر نہیں ہوں بلکہ اُس کی فنی تشریح کر رہا ہوں جن چیزوں کا تم نے نام لیا، ہو سکتا ہے کہ وہ یا اسی قسم کی چند اور چیزیں اپنی حیثیت میں بُری ہوں لیکن فن کے اعتبار سے کیا تم گھوڑ دوڑ اور کشتی میں فتح حاصل کرنے کو ہنر اور کاریگری نہیں سمجھتے۔ اِس صنعت کے خیال میں رہ کر تو تم شاعری، موسیقی، مصوری اور نقاشی وغیرہ کو کہ جن کا شمار فنونِ لطیفہ میں سے ہے آرٹ کی حد سے بالکل خارج کر دو گے۔ میں اِن سب چیزوں کا دلدادہ ہوں اور آج دنیا کے ہر گوشے میں آرٹ کا عروج اور ترقی دیکھنا چاہتا ہوں بشرطیکہ اُس آرٹ کی بنیاد زندگی کی تعمیر پر موقوف ہو۔"

"امیرالمومنین۔ ریڈیو تو آپ روز سنتے ہونگے! میں نہیں سمجھا کہ بلا ناغہ یہ گیت کیوں گائے جاتے ہیں۔ یہ نغمے کیوں الاپے جاتے ہیں، موسیقی کی یہ تانیں کیوں اُڑائی جاتی ہیں"

"اس لئے کہ موسیقی کو دُنیا کی عام فہم زبان سمجھا جاتا ہے۔"

"لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم دوسرے ممالک کی موسیقی کو اکثر ناپسند کرتے ہیں۔"

"تمہارا اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ

تم اُس کو اتنا سنو کہ تم کو اُس کی عادت ہو جاتے تم جس طرح دوسرے ملکوں کی موسیقی اور پکے گانوں کو ناقابلِ فہم سمجھ کر اُن پر اعتراض کرتے ہو کیا اسی طرح تم نئی شاعری کی مذمت نہیں کرتے۔ تم اپنے غالب ہی کو لے لو۔ غالب اپنی زندگی میں اپنی مشکل بیانی کی وجہ سے کس قدر بدنام تھا لیکن آج وہ مقبولِ عوام ہے اُس کے اشعار لوگوں کی وردِ زبان ہیں۔ فلسفہ، تصوف، تغزل تمام اوصافِ شاعری اُس کے کلام میں پیدا ہو گئے ہیں لوگ اصل میں مردہ پرست واقع ہوئے ہیں"

"امیرالمومنین کا مصوری کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟"

"مجھے تمہاری مصوری کا حال بھی خوب معلوم ہے، تمہارے عجائب خانے اور آرٹ گیلریز سب برائے نام ہیں۔ وہ صرف دن کے وقت کھلتی ہیں جب عام لوگ اپنے کام کاج میں مصروف ہوتے ہیں اور بجز شائقین کوئی دوسرا وہاں نہیں جاتا۔ حالانکہ مصوری، نقاشی اور خطاطی کا تقاضا تو یہ ہے کہ غیر صاحب مذاق بھی اُس کو دیکھ کر متاثر ہو جائے۔ میں اِن عجائب خانوں کو رات کے وقت بھی دو تین گھنٹے کھلا رکھنا چاہتا ہوں تاکہ جو نہ دیکھنے والے ہوں وہ بھی آ کر دیکھیں اور مستفید ہوں"

"امیرالمومنین نے موسیقی، مصوری، نقاشی اور خطاطی کا جواز تو بڑی خوبی سے ثابت کر دیا لیکن مجھے یقین ہے کہ گھوڑ دوڑ تو امیرالمومنین کو بھی ناپسند ہو گی، کیونکہ اِس کے ذریعے خواہ مخواہ جوا کھیلا جاتا ہے اور بلاوجہ بربادی ہوتی ہوتی ہے"

"ہاں۔ لیکن گھوڑوں کو پالنے، سدھانے اور خود دوڑنے اور دوڑانے میں آدمی خوب طاق ہو جاتا ہے، گھوڑوں کے پالنے کا شوق اہلِ عرب میں دنیا

کی تمام قوموں سے زیادہ ہے اُن کو اپنے گھوڑوں کے نام، رنگ اور حلیہ تک یاد رہتے ہیں، اور اس کے لئے اُن کے ادب میں سینکڑوں الفاظ موجود ہیں، یہ گھوڑ دوڑ بھی انہی کی ایجاد ہے، گھوڑ دوڑ کا ذکر کر کے تم نے کتوں کے متعلق ایک دلچسپ بات یاد دلا دی۔ کتوں کی نسل بڑھاتے وقت اُن کی ذات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے کوئی اُن شوقینوں سے پوچھے کہ جب تمہارے اپنے بچوں کا سوال درپیش ہوتا ہے تو کیوں غفلت برتی جاتی ہے۔ اور اپنی غلطی کو محض ایک اتفاق اور مشیتِ ایزدی پر کیوں ٹالا جاتا ہے"

"واقعی ہم اُس وقت اپنی غلطی محسوس نہیں کرتے اور دوسری غیر متعلق باتوں پر گھنٹوں بحث و تمحیص کیا کرتے ہیں۔ اِس کا نام ہم نے تنقید رکھا ہے آخر اور کریں بھی کیا۔ اگر ان باتوں سے دل نہ بہلائیں تو رات دن فکر کرتے کرتے گھل جائیں اِس جنگ نے کیا کچھ تھوڑا پریشان کر رکھا ہے۔ یہ جنگ بھی کیسی بُری بلا ہے"

مولائے حسن۔ میں یہ سلسلۂ گفتگو ختم کر کے تمہیں رخصت کرنے والا تھا کہ تم نے یہ جنگ کی بات چھیڑ دی اور میں دیکھتا ہوں کہ تم اِس سے بہت زیادہ خائف نظر آتے ہو۔ تم بھی کس قدر سادہ لوح ہو کہ اس جنگ کے معمولی فلسفہ کو بھی نہیں سمجھتے"

"امیر المومنین آخر یہ جنگ کیوں ہوتی ہے؟"

"حسن۔ سنو! جوں جوں وقت اور زمانہ گذرتا جاتا ہے انسان کا علم اور تجربہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ سائنس کی بدولت آئے دن نت نئی ایجادیں ہو رہی ہیں جو چیزیں پہلے ہمارے استعمال میں آتی تھیں۔ آج اُن کی جگہ دوسری قیمتی اور زیادہ کارآمد اشیا نے لے لی ہے۔ اِسی طرح پہلے زمانے کی لڑائیوں میں صرف تیر، تلوار، نیزے اور بھالے استعمال ہوتے تھے۔ اب اُن کی بجائے بندوقیں توپیں، مشین گنیں، ٹینک، بمبار، ہوائی جہاز آبدوز کشتیاں اور زہریلی گیسیں کام

میں لائی جاتی ہیں۔ انسانی آبادی کے ساتھ ساتھ جس قدر یہ چیزیں زیادہ ہوتی جاتی ہیں اُسی قدر طاقت و قوت کے اظہار اور ملک گیری کی ہوس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ دو سلطنتیں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں"

"لیکن امیرالمومنین! کہا اور سمجھایا تو یہ جاتا ہے کہ ہم امن اور سکون قائم کرنا چاہتے ہیں، ہم تم کو دشمن سے آزادی دلانے کے لئے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے ہیں، کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ جنگ جسقدر جلد ختم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے"

"جنگ اگر جلد ختم ہو جائے تو جتنے نیک اور بہادر انسان ہیں وہ جلد مر جائیں بہادر سپاہی کو ہمیشہ اپنی فتح کا یقین ہوتا ہے اس لئے وہ آگے بڑھکر سب سے پہلے لڑتا ہے اور سب سے پہلے مرتا ہے۔ سپاہی کی زندگی دراصل اُس کی موت میں مضمر ہے اگر نتیجہ دیر میں برآمد ہو تو ظاہر ہے کہ بھاگنے والے سپاہیوں کو بھی موت کا ذائقہ چکھنا پڑے۔ جنگ کی بدولت ملک کے مِل اور کارخانے چلتے ہیں، صنعت و حرفت میں غیر معمولی ترقی ہوتی ہے بے روزگار صاحبِ روزگار، مزدور خوشحال اور سرمایہ دار لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔ آؤ اب ریڈیو پر جنگ کی تازہ خبریں سنیں، ارے وہاں تو الف لیلہ کی کوئی کہانی نشر ہو رہی ہے"

"اے امیرالمومنین آپ ہی ذکرِ خیر ہو رہا ہے، غور سے سنئے وہ انوری بغداد کی شان میں کچھ اشعار پڑھ رہا ہے"

اشعار

خوشا نواحیِ بغداد جائے فضل و ہنر | کہ کس نشان نہ دہد در جہان چناں کشور
سوادِ او بمثل چوں سپہر مینا رنگ | ہوائے او بصفت چوں نسیم جاں پرور
ہزار ورق خورشید شکل بر سر آب | بر آں صفت کہ پراگندہ بر سپہر اختر
بے شبہ باغ شود بوستاں بوقتِ غروب | بشکل چرخ شود، بوستاں بوقت سحر

مرحبا، مرحبا، مرحبا

مرزا رسوا
ادبی عدالت میں

مقام .... لکھنؤ		مدعیہ .... امراؤ جان ادا
مدعا علیہ	مرزا ہادی رسوا	وکیل مدعیہ ..... اکبر علی خاں
عدالت ـــــ چپڑاسی ـــــ		وقت ـــــ زمانۂ حال

چپڑاسی کوئی مرزا ہادی رسوا حاضر ہے، مرزا ہادی رسوا مدعا علیہ حاضر ہے،
مرزا ...... ہادی .... رسوا -

رسوا آداب بجا لاتا ہوں سرکار

عدالت تم ہی مرزا رسوا ہو -

اکبر علی خاں ان کے سوا اور کون رسوا ہو سکتا ہے، آپ کا اصل نام مرزا ہادی ہے۔ خیر سے آپ چونکہ ادیب اور شاعر بھی ہیں اس لئے لوگوں میں رسوا کے نام سے مشہور ہیں ؎

گر نام و نشانِ او پرسند، بگو قاصد
آوارہ و مجنونے رسوا سرِ بازارے

رسوا میں بھی کچھ عرض کروں ؟

عدالت کہو

رسوا
آمادہ بہ قتلِ من آں شوخ ستمگار ے
ایں طرفہ تماشا بیں ناکردہ گناہگار ے

عدالت خوب! وکیل صاحب آپ قانون سے واقف ہوتے ہوئے بھی عدالت کے روبرو اُن کو آوارہ ومجنوں کہہ رہے ہیں، عدالت کوئی بات خلافِ تہذیب اور قانون سننا نہیں چاہتی۔

اکبر علیخاں میں عدالت کو اس کا یقین دلاتا ہوں۔

عدالت لیکن تم اُن کو آوارہ ومجنوں کہہ چکے ہو پہلے اِس کا ثبوت دو۔

اکبر علیخاں آوارہ ومجنوں کے جس مشہور لقب سے میں نے اپنے فاضل دوست کو یاد کیا ہے اس کی وجہ عرض کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دن سے مرزا رسوا نے جوانی میں قدم رکھا۔ اُسی وقت سے وہ اپنے آپ کو اقلیم عشق کا بادشاہ تصور کرتے ہیں ؎

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی اِن سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

آپ کا اکثر وقت عیش وکامرانی میں گذرا ہے، ہر روز روزِ عید ہر شب شبِ برات مناتے رہے، رات دن رقص وسرود کی محفلیں، شوقِ بادہ وساغر اور ذکرِ حسن وعشق، وہ کون بھلا بسم اللہ جان، امیر جان، خورشید جان، گنگا جان، مرزا صاحب ذرا بتائیں تو کس کا گانا انھوں نے پسند نہیں کیا اور کس کا رقص دیکھکر انھوں نے یہ نہیں کہا ؎

تم سلامت رہو قیامت تک ٭ اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو

لیکن آج وہ سب اُن کی نظروں میں ذلیل وخوار ہیں۔ انہی عورتوں میں

سے امراؤ جان ادا بھی ہے۔ میری غریب موکلہ۔ جس کے متعلق ہمارے ہادی،
مرزا رسوا صاحب اپنی اِس تصنیف میں — عدالت ملاحظہ فرمائیے —
یہ بڑے زور کے ساتھ کہہ چکے ہیں ؎

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم ٭ چھوڑونگا اب نہیں تمہیں رسوا کئے بغیر

عدالت کیا یہ مرزا رسوا کی کتاب ہے

اکبر علیخاں جی۔ یہ انہی کی تصنیف ہے، عدالت ملزم سے دریافت کرسکتی ہے،
یہ تو اُن کی ادبی اور معنوی اولاد ہے۔ رسوا جیسے قابل ادیب اپنی اس
شہرۂ آفاق تصنیف سے کیوں کر منکر ہو سکتے ہیں۔

عدالت مرزا رسوا۔ کیا تمہیں اِس امر کا اقبال ہے کہ تم ہی اِس کتاب کے مصنف ہو

رسوا مجھے اس واقعہ کی صحت سے انکار ہے۔

عدالت پھر یہ کس کی تصنیف ہے۔

رسوا حقیقت میں یہ بی امراؤ جان ادا کی سرگذشت، اُن کی آپ بیتی خود
انہی کی زبانی ہے۔ میں نے اس کوشش کر محض ایک راوی کی حیثیت
سے ایک کتاب کی شکل میں پیش کردیا ہے۔

عدالت جو کچھ اِس کتاب میں لکھا ہے تمہیں اُس کا تو اقرار ہے۔

رسوا اگرچہ یہ میرا دستخطی نسخہ تو نہیں تاہم اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے میں
اِس کے ایک ایک حرف کا ذمہ دار ہوں۔

عدالت امراؤ جان۔ اس کتاب کے نفسِ مضمون کی وجہ سے تمہیں رسوا کے
خلاف کیا شکایت ہے خود بیان کرو۔

اکبر علیخاں امراؤ بیگم۔ سنتی ہو، عدالت تم سے مخاطب ہے بتاؤ مرزا رسوا کے خلاف
تم کیا کہنا چاہتی ہو؟

رسوا میں عدالت کو اس جگہ یہ بات نوٹ کرانی چاہتا ہوں کہ امراؤ جان اداؔ ایک طوائف ہے اور طوائف کبھی پردہ نشین نہیں ہوتی امراؤ جان نے آج تک کسی سے پردہ نہیں کیا اِس وقت وہ پردہ کر کے عدالت کو دھوکا دینا چاہتی ہے۔

اکبر علی خاں میں معزز عدالت پر یہ واضح کروں گا کہ اِس وقت پردے کی بحث بالکل بیکار ہے۔ ہاں اگر رسواؔ صاحب کو یہ شبہ ہو کہ فینس میں اداؔ کی بجائے در پردہ کوئی اور ہے تو بیشک وہ عدالت کی اجازت سے پردہ اٹھا کر امراؤ جان کو دیکھ سکتے ہیں، عدالت کا احترام بھی تو آخر لازمی ہے، امراؤ جان صرف ایک رقاصہ ہے، اور اگر وہ طوائف ہے۔ تو مرزا صاحب کو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ وہ ایک عورت ہے۔ امراؤ جان! اب تم خود کہو تمہیں کیا شکایت ہے؟

امراؤ جان حضور۔ میں ایک رقاصہ اور سچ پوچھئے تو رقاصہ کے روپ میں ایک بدنصیب ناشدنی، شریف کوک کی عورت ہوں، میرا اصل نام جو میرے ماں باپ نے رکھا تھا "امیرن" ہے لیکن اب امراؤ جان اداؔ کے نام سے مشہور ہوں۔

عدالت مرزا رسواؔ کو تم کب سے جانتی ہو۔

امراؤ جان مرزا رسواؔ میرے پرانے ملاقاتی ہیں۔ انھیں میرے حالات و واقعات زندگی کا علم ہے، ایک اُنہی پر کیا موقوف ہے، رقاصہ کے حالات تو سب ہی جانتے ہیں، پھر ایک رقاصہ کی سرگذشت کیسی؟ اُس کی داستانِ زندگی تو ایک ایسی کتاب ہے جس کو ہر عاقل و بالغ پڑھ سکتا ہے۔ پڑھکر نہ سمجھے یا سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرے تو یہ اُس کے دماغ کا فتور،

عدالت تم نے اپنی سوانح عمری کبھی مرزا رسوا سے بیان کی۔

امراؤجان جی نہیں۔ میں نے اپنے واقعات کبھی کسی کے سامنے نہیں دوہرائے کوئی سنانے کی چیز ہو تو سنائی بھی جاتے۔ میری یہ آپ بیتی مرزا جی کی ایک من گھڑت کہانی خود اُن کی زبانی ہے۔

عدالت لیکن اس فرضی ناول لکھنے کی وجہ۔

امراؤجان نام اور شہرت کی خاطر تو نہیں کیونکہ خود ہی رسوا ہیں ہاں یقیناً انھیں کچھ روپیوں کو ضرورت ہو گی۔ ان کا اور دوسروں کا دیا بہت کچھ میرے پاس تھا جتنا مانگتے میں دے دیتی۔ انھوں نے خودداری کے باعث مجھ سے تو نہیں مانگا لیکن یہ ناول لکھکر رقم کمالی۔ آپ پارسا بن گئے مجھ کو خوب پیٹ بھر کر بدنام کیا۔ وہ کیچڑ گریدی وہ گو اُچھالا کہ میں سارے زمانے میں بدنام اور نکو ہو گئی۔

عدالت کیونکر بدنام ہوئیں بیان کرو۔

امراؤجان میرے گانے اور ناچنے کو جسے میں نے ایک فن کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے مرزا صاحب نے اُسے گناہ اور عیب قرار دیا ہے حالانکہ وہ خود اُس کے دلدادہ ہیں اور تو اور وہ مجھ پر میرے پیشہ کے متعلق جو خدا ہی جیسے مردوں کا عطیہ ہے تو جو کچھ نہ کہنا تھا وہ کہا لیکن اس کے علاوہ مجھ پر افیون اور شراب خوری کا جھوٹا الزام لگاکر میرے ذاتی چال چلن پر بھی حملہ کیا ہے، میں فریاد لائی ہوں، انصاف کی مستحق ہوں، داد چاہتی ہوں۔

عدالت مرزا رسوا۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟

رسوا ضرور عرض کروں گا۔ عدالت پر یہ تو واضح ہو گیا کہ امراؤجان ادا لکھنؤ

کی ایک لکھی پڑھی طوائف ہے اِس طبقے کی عورتیں اکثر ویسے ہی لسّان ہوتی ہیں لیکن امراؤ جان ضرورت سے زیادہ تیز اور چرب زبان واقع ہوئی ہے۔ اس کا اپنی سرگذشت بیان کرنے سے منکر ہونا مجھ پر ایک قطعی الزام ہے اس لئے کہ وہ ایک جگہ خود اپنے الفاظ میں یہ اعتراف کر چکی ہے ——" کہ میری سوانح عمری میں جو اُمور آپ نے قلمبند کئے ہیں وہ سب کچھ مجھ پر گذرے ہیں"۔ ملاحظہ کیجئے صفحہ (۲۴۰)

اکبر علی خاں واہ جناب واہ ع خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ، یہ امراؤ جان ادا کے الفاظ کہاں سے ہوئے۔ آپ ہی کی تصنیف آپ ہی کی تحریر اور آپ ہی کے الفاظ، خیر۔ میں آپ ہی کے الفاظ سے آپ کا جواب غلط ثابت کروں گا۔ صفحہ (۲۵) پر جہاں مقدمہ کی عبارت ختم ہوتی ہے اور رسوا کے دستخط ثبت ہیں وہاں یہ صاف لکھا ہوا ہے ——
"کہ اس سرگذشت میں جو کچھ بیان ہوا مجھے اُس کے حرف بحرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مگر یہ میری ذاتی رائے ہے ناظرین کو اختیار ہے جو چاہیں قیاس کریں"۔

رسوا ایک کہانی لکھنے والا اکثر اپنی کہانی کو سچی بتاتا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو اس قصّے سے ایک خاص دلچسپی اور اُس کے مصنف سے کچھ لگاؤ پیدا ہو جاتے۔ چونکہ میں نے اس سرگذشت کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کو خودستائی کے الزام سے بچنے کے لئے ناظرین کے قیاس پر چھوڑ دیا ہے۔ اِس لئے اس سے جو نتیجہ میرے فاضل وکیل صاحب نکال رہے ہیں سراسر غلط ہے۔

اکبر علی خاں معاف کیجئے! اس قسم کی لفظی بحث سے صفائی ہونا ناممکن ہے۔

آپ کی ذاتی رائے آپ کی ترجمان نہ ہوتی تو کیا ادبی نقاد آپ کے شاعرانہ مبالغوں اور تحریروں پر صاد کرتے، رہی خودستائی اس میں بھی ادبی ڈھونگ بازی اور شہرت کی ہوس کے سوا اور کیا رکھا ہے، اگر جھوٹ کے ڈھول اس مکاری اور عیاری سے نہ پیٹے جائیں تو آپ کی اس ادبی مصوری کا پلندہ گھر میں یوں ہی پڑا رہے اس کے بغیر اہلِ قلم مشہور ہونا ناممکن۔

رسوا آپ کو میری ادبی زندگی کی کیا خبر اور اُس سے کیا واسطہ۔

اکبر علی خاں مجھے معلوم ہے کہ آپ اہلِ قلم ہیں اور بڑے معرکہ کے لکھنے والوں میں ہیں داستان گوئی اور سیرت نگاری آپ ہی کا حصّہ ہے لیکن آپ کا ہر ناول آپ کے انہی تجربات کا نتیجہ ہے جو آپ کو اپنی عیش پرستی سے حاصل ہوتے ہیں۔

رسوا لیکن صاحب ہم اَدب میں اپنی روزمرہ کی زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اب تک ہمارا ادب برائے ادب اور صاف لفظوں میں ادب کا مقصد محض ادبی چاشنی اور دماغی عیاشی رہا ہے، حالانکہ جب تک وہ ادنیٰ طبقوں کے نقطۂ نظر سے زندگی پر کوئی روشنی نہ ڈالے اور اُس ظلم، بے انصافی اور لوٹ مار کو بے نقاب نہ کرے جس کے نیچے ہمارے عوام کچلے جارہے ہیں بالکل بے جان اور لغو ہے، ایسے اَدب سے ہمیں کوئی اجتماعی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اکبر علی خاں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنے اِس ناول میں اجتماعی زندگی کے کون سے فائدہ کو مدِّ نظر رکھا ہے۔

رسوا میں نہیں چاہتا کہ ہماری معاشرت میں راگ ورنگ کے بہانے شرفا

کی دولت صحت اور عزت برباد ہو۔

اکبر علی خاں خوب! آپ ایک طرف تو عوام کی ہمدردی میں گھلے جا رہے ہیں اور دوسری طرف شرفا کی دولت عزت اور صحت کے محافظ کا روپ بھرتے ہیں خیر فی الحال اس بحث سے قطع نظر آپ نے اپنی برئیت کا بہت اچھا پہلو نکالا۔ آپ کے پچھلے کارناموں پر تو اس وقت کوئی تبصرہ کرنا بیکار ہے لیکن ہاں اتنا ضرور ہے کہ آپ کو اپنے اس نظریہ کے ماتحت کم از کم یہ ناول لکھتے وقت رسم و رواج کی اصلاح لازمی طور سے پیش نظر ہو گی۔

رسوا یقیناً۔

اکبر علی خاں شادی بیاہ کی رسوم سے آپ واقف ہیں؟

رسوا صرف مسلمانوں کی رسوم کے متعلق جانتا ہوں۔

اکبر علی خاں میرا اشارہ بھی انہیں کی طرف ہے۔

رسوا فرمایئے کونسی بات دریافت طلب ہے۔

اکبر علی خاں یہ بتایئے کہ ہماری شادی اور بیاہ کے موقعوں پر ڈومنیاں جوگالیاں اور سیٹھنیاں شریف عورتوں کے روبرو مٹک مٹک کر گاتی ہیں. وہ آپ کے نزدیک قابلِ اصلاح ہیں یا نہیں۔

رسوا ضرور ہیں

اکبر علی خاں لیکن آپ کے ناول میں جہاں اس بات کا ذکر آیا ہے وہاں آپ امراؤ جان سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں "کہ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو اِن باتوں پر نکتہ چینی کریں"

رسوا واہ، واہ، واہ! کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا،

آپ گالیوں اور سیٹھنیوں کو موسیقی سے کیوں تعبیر کرتے ہیں۔

اکبر علی خاں بہت اچھا آپ اُسی موسیقی کو بحث میں لائیے جو سارنگی اور طبلہ پر سننے میں آتی ہے اور جسے آپ عشوہ فروشی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی کی اصلیت اور خوبی تو یہاں بھی اپنی جگہ برقرار ہے اس لئے کہ یہ نہ صرف فنونِ لطیفہ میں سے ہے بلکہ اسی موسیقی کے ذریعہ پرستارانِ توحید عالمِ وجد اور کیف و سُرور میں عشقِ الٰہی حاصل کرتے ہیں۔

رسوا لیکن یہ گانے کے ساتھ ساتھ ناچنا اور تھرکنا؟

اکبر علی خاں اگر یہ آپ کے نزدیک بُرا ہے تو کیا آپ کے مشاعرے مجروں کے مترادف نہیں ہوتے جہاں اکثر شاعرانِ شیریں مقال خوش گفتار نہ صرف جھوم جھوم کر گاتے بلکہ خیر سے بتاتے بھی جاتے ہیں، رقاصہ تو یہ سب کچھ اپنے پیٹ کے ایندھن کے لئے کرتی ہے لیکن ہمارے شاعر مصنوعی داد اور فرضی واہ واہ کے لئے گانے اور ناچنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ایسے ستم ظریف بھی ہیں جو مخمور ہو کر آتے ہیں۔

رسوا کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ عورت شراب اور موسیقی یہ تینوں چیزیں ایک انسان کو احمق بنانے کے لئے ضرورت سے زیادہ کافی ہیں۔

اکبر علی خاں اچھا آپ یہ تو فرمائیے کہ آپ نے امراؤ جان ادا پر یہ تمام الزامات کہ وہ "ایک گھاگ عورت ہے۔ لوگوں کے چہرے دیکھنے کی شوقین ہے دولت لوٹنے والی ہے۔ اس کی آرزو مند ہے کہ سب اُسی کو چاہیں اور وہ سچ مچ کسی کو پسند نہ کرے" کس بنا پر قائم کئے ہیں — ٹھنڈی

ٹھنڈی سانسیں بھرنا۔ بات بات پر رو دینا۔ دو دو دن نہ کھانا۔ کنوئیں میں پیر لٹکا کے بیٹھ جانا۔ سنکھیا کھا لینا، کفن کا چونگا کرنیوالی" یہ سب باتیں اُس کی نسبت کیوں تحریر کی گئیں؟۔

رسوا اِس لئے کہ یہ تمام کھیل وہ اپنی زندگی میں کھیل چکی ہے، اُس پر بیتے ہوئے واقعات سے اُس کا کریکٹر صاف ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود میں اُس کی نسبت بہت اچھا خیال رکھتا ہوں چنانچہ میں نے کئی جگہ اُس کے منہ پر اس کی تعریف کی ہے۔ گوہر مرزا کی داد و دہش کے ذکر میں امراؤ جان کی عالی ظرفی کا اعتراف کیا ہے، میں اِس کا بھی معترف ہوں کہ وہ گناہ کو ہمیشہ بُرا سمجھتی تھی اور خانم کے مکان پر جہاں وہ اپنی بدبختی کے باعث لائی گئی تھی رہنے سے ایک گھر والی بن کر رہنے میں اپنی بہتری سمجھتی تھی وہ ایک شریف گھر میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی شہزادوں اور نوابوں کی صحبت اٹھائی۔ کربلائے معلیٰ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور اب بھی رہنے سہنے کا طریقہ شریف عورتوں کا سا ہے۔

اکبر علی خاں قاعدہ ہے کہ اکثر مصنف اپنے ہیرو اور ہیروئن کی حمایت کرتے ہیں اور اُس کا کریکٹر شروع سے آخر تک اچھا دکھاتے ہیں تعجب ہے کہ آپ کو اپنی ہیروئن کے کریکٹر پر اسقدر اعتماد ہے لیکن اِس کے باوجود آپ نے اُس کو پبلک میں اسقدر بدنام کیا۔

رسوا امراؤ جان کہاں رسوا ہوئی، ایک طوائف کی زندگی روشنی میں آئی طوائف اپنے مکر و فریب کے باعث خود بدنام ہوئی۔

اکبر علی خاں کیا خوب! مردوں کی حیوانیت عورتوں کی نسوانیت پر حملہ آور ہو تو

کوئی حرج نہیں اگر عورتیں دغا اور فریب سے کام لیں تو قابلِ سزا۔ عورت کا گناہ تو گناہِ عظیم، مرد گناہگار ہونے کے باوجود معصوم اور فرشتہ۔ کچھ غیرت ہو تو مرد اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنی حیوانیت اور نفسانیت کا تماشا دیکھیں جو اپنے نفس کی خواہش کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں" یہ کچھ میرا کہنا نہیں قاضی عبدالغفار صاحب کی آواز ہے جو آپ ہی کے زمرہ میں سے ہیں اور ایک مُستند ادیب ہیں۔

رسوا فلسفۂ اخلاق کی اس بحث سے آپ کا مقصد۔

اکبر علی خاں مقصد یہ کہ عورت ہماری آئندہ نسلوں کا گہوارہ ہے، اُسی پر ہماری قومی آزادی اور ترقی کا انحصار ہے۔ جب تک ہندوستان کی مظلوم عورت کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ کیا جائے گا ہمارا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

رسوا یہ تو حقیقت ہے لیکن ایک طوائف یا رقاصہ کو آپ طوائف یا رقاصہ ہی تو کہیں گے۔

اکبر علی خاں لیکن جب آپ کو رقاصہ کی ذات سے دشمنی ہے تو رقاصہ کے کردار کو عریاں اور ذلیل کیجئے آپ اس میں آزاد اور مختار ہیں، آپ نے اپنے ناول کو امراؤ جان اداؔ سے کیوں منسوب کیا اُس کو اپنی مثال کیوں بنایا۔

رسوا وہی اجتماعی زندگی کا فائدہ جسے میں اپنے نظریۂ ادب میں پیش کر چکا ہوں۔

اکبر علی خاں بارے موسیقی کے تو آپ قائل ہو گئے اب صرف ادب کا مسئلہ باقی رہ گیا۔ براہ مہربانی یہ بتائیے کہ ادب ہماری زندگی کا ترجمان

ہوتے ہوئے بھی ہمارے فعل و عمل کو کیوں متاثر نہیں کرتا۔

رسوا یہ ہمارا اپنا قصور ہے ہم خود غرض اور خود پرست واقع ہوئے ہیں ورنہ جس نظام کے ماتحت ہم زندگی بسر کرتے ہیں اگر ہم اُس سے ناامید ہو کر اُس کے بنیادی اصولوں کو تبدیل کر دیں تو یقیناً وہ اجتماعی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جو ہمارے ادب کا مقصد ہے۔

اکبر علی خاں بہرحال اِس خود غرضی اور خود پرستی میں عوام و خواص دونوں ہی شامل ہوئے، مرد بھی اور عورت بھی کسی محدود طبقے کا ادب تو نہ رہا نا، پھر مرد و عورت کے جھگڑے میں آپ تنہا عورت کو کیوں مطعون اور بدنام کریں۔

عدالت مرزا رسوا۔ تم اپنی صفائی میں کچھ اور کہنا چاہتے ہو۔

رسوا یہی کہ میرا مقصد امراؤ جان اداؔ کو رسوا کرنا نہ تھا جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کر چکا۔

اچھا ہم فیصلہ صادر کرتے ہیں:۔

فیصلہ

ناول "امراؤ جان اداؔ" میں ایک رقاصہ کی سرگذشت جو مدعا علیہ نے بیان کی ہے وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ٹھیک ہے لیکن امراؤ جان اداؔ کی زبان سے جو ایک شریف گھرانے کی بیٹی ہے رقاصہ کی کہانی ہیروئن کی حیثیت سے بیان کرانا ہندوستان کے ماحول اور مشرقی روایات کے قطعی خلاف ہے بحث سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امراؤ جان

ادا نے رقاصہ کا پیشہ خود اختیار نہیں کیا بلکہ پیشہ نے
اُسے اختیار کر لیا وہ اپنے گھر سے آپ نہیں آئی، لائی گئی۔
اس لئے ناول اور اُس کے مضمون کا اُس سے منسوب ہونا۔
واقعات اور انصاف کی رُو سے بالکل غلط اور ناجائز ہے
چونکہ مرزا رسوا کی نیت ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے
اِس جُرم میں کہ مصنف نے اپنی تصنیف کو امراؤ جان ادا
کے نام سے شائع کیا اور شہرت دی، ہم یہ سزا تجویز کرتے
ہیں کہ موجودہ ایڈیشن کی تمام کاپیاں بحقِ سرکار ضبط اور
آئندہ جب یہ ناول دوبارہ شائع ہو تو امراؤ جان ادا
کا نام تحریر سے بالکل خارج کر دیا جائے۔

دستخط۔ ادبی عدالت

مطالعہ

ایک خریدار اور کتب فروش کے درمیان گفتگو

"کیوں جناب آپ کے ہاں "مشیر زندگی" ہے؟
"جی ہاں، موجود ہے، تشریف رکھئے، ابھی پیش کرتا ہوں"
"کیسی کتاب ہے یہ آپ کے خیال ہیں"
"بہت اچھی ہے"
"ہاں آج کل اِس کا اشتہار تو خوب ہو رہا ہے"
"لیکن یہ اشتہاری دوائیوں کی طرح کوئی بازاری کتاب نہیں، اِسے کسی معمولی آدمی نے نہیں لکھا جس طرح بعض اپنے پیٹ اور شہرت کی خاطر کچھ اِدھر اُدھر سے نقل کر کے لکھ دیتے ہیں"
"ارے صاحب! ہر کتاب کے متعلق یہی کہا جاتا ہے لیکن جب پڑھو تو کچھ بھی نہیں، اچھا۔ یہ آپ کیش میمو بھی کاٹنے لگے، ذرا دیکھنے تو دیجئے کتاب لینے کے قابل بھی ہے یا نہیں"
"یہ کتاب! صاحب!! اِس کو آپ ناپسند کر ہی نہیں سکتے" اِس قدر مقبولِ عوام ہے کہ ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے میرے پاس اِس مضمون کی اور بھی بہت سی کتابیں ہیں لیکن میں اپنے تھوڑے سے فائدے کے لئے اِس

کے مقابلہ میں کوئی دوسری کتاب پیش نہیں کر سکتا۔ کیا کروں مجھ سے اوروں کی طرح ضمیر فروشی نہیں ہوتی"

"آخر اس میں ہے کیا؟"

"میں عرض کرتا ہوں کہ مصنف نے اِس کتاب میں اپنی اور اوروں کی زندگی کے وہ بہترین اور زرّیں اصول پیش کیے ہیں کہ اگر ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو یقیناً ہماری زندگی ایک کامیاب اور قابلِ رشک زندگی بن جائے آپ اِس کو لے جا تو رہے ہیں دو چار گھنٹے اطمینان سے پڑھیں گے تو آپ کو تمام حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یہاں ایک دو منٹ میں اِس کے متعلق کیا اندازہ ہو سکتا ہے سوائے اس کی ظاہری خوبصورتی کے، میں نے خود اِس کتاب کو پڑھا ہے اور یقین کیجیے کہ ہماری دوکان کا کوئی سر پرست ایسا نہیں جس نے اِس کتاب کو نہ خریدا ہو، اگر کوئی انگریز مصنف اس کتاب کو لکھتا تو کم از کم اس کی قیمت دس پندرہ روپے ہوتی اور آپ اسے صرف ڈھائی روپے میں لیے جا رہے ہیں"

"یہاں روپوں اور پیسوں کا کوئی سوال نہیں، ہم کو تو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ کچھ پڑھیں، اچھا لائیے دیجیے"

"یہ لیجیے ایک فہرست بھی لیتے جائیے اور فرمائیے کوئی تاریخی یا جاسوسی ناول، بہترین اصلاحی اور معاشرتی افسانے، اچھے اچھے ڈرامے، مشہور شاعروں کا کلام عورتوں اور بچوں کے لئے مفید دلچسپ اور خوبصورت کتابیں، کچھ ہندوستان کی سیاست کے متعلق عمدہ لٹریچر"

"نہیں نہیں جناب! میں نے کہا نا ہم کو تو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ کچھ پڑھیں پھر خواہ مخواہ آپ کو تکلیف دینے سے فائدہ۔"

"آپ لیں یا نہ لیں اس کا کوئی فکر نہیں لیکن آخر چند کتابیں دیکھ لینے میں آپ کا حرج بھی کیا ہوگا بس اِس بہانے آپ سے دو چار باتیں ہی کرلوں گا اگر آپ کو ناگوارِ خاطر نہ ہو"

حرج ورج تو کچھ بھی نہیں لیکن کیا کہیں صاحب! ہم تو اس پڑھنے کے معاملہ میں بہت ہی چور ہیں"۔

"لیکن مطالعہ تو ضروریاتِ زندگی میں سے ہے، جناب یہی تو ایک چیز ہے جو ہماری دنیا کو بہتر بنا سکتی ہے، اب تک جو کچھ ہم نے حاصل کیا وہ صرف مطالعہ کی بدولت اور آئندہ جس قدر ترقی کریں گے وہ سب مطالعہ کے ذریعہ اس کے بغیر تو کوئی چارہ ہی نہیں یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو فرصت نہ ملنے کے سبب مطالعہ کا موقعہ بہت کم ملتا ہے لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ ہمارے بہت سے سرپرست باوجود رات دن مطالعہ کرنے کے ہم سے ہمیشہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ہم کو مطالعہ کے لئے کچھ نہیں دیتے"۔

واہ واہ یہ جو سینکڑوں ہزاروں کتابیں کتب خانوں اور لائبریریوں میں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی چھپتی رہتی ہیں کیا یہ سب ان کے مطالعہ کے لئے کافی نہیں، میں تو کہتا ہوں کہ اگر وہ بلا ناغہ چوبیس گھنٹے بھی پڑھیں، تب بھی وہ شاید اپنی تمام عمر میں ان کتابوں کو ختم نہیں کر سکتے"۔

یہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا' واقعی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، آج کل مرد و عورت جوان اور بوڑھے عام طور پر اس زمانہ کی مطبوعات کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں. لیکن مصیبت یہ ہے کہ معیاری اور عمدہ کتابیں اُن کی نظر سے بہت ہی کم اور مشکل سے نکلتی ہیں حالانکہ ضرورت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو مطالعہ کا صحیح ذوق رکھتا ہے اِس قابل ہو کہ وہ اچھی کتابیں انتخاب کر سکے اور

مطالعہ کے صحیح اصولوں کی روشنی میں پڑھ بھی سکے، اور یاد رکھئے جب ہی ہم اپنی دنیا اچھی اور اپنا مستقبل روشن بنا سکتے ہیں اِس کے بغیر ترقی ناممکن"

"لیکن اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ مطالعہ کی وسیع ضرورت کو واضح کرنے میں آپ کا مقصد کسیقدر تاجرانہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جسقدر پڑھنے والے زیادہ ہوتے جائیں گے اُسی قدر آپ نئی نئی کتابیں شائع کرنے اور اپنی تجارت کو چمکانے میں کامیاب ہوں گے"

"دیکھئے مطالعہ تو ہے کچھ اور چیز، اور کتابیں چھاپنا اور فروخت کرنا یہ ہے تجارت، مطالعہ کے اصول اور ہیں اور تجارت کے اصول اور، یہ ہوسکتا ہے کہ سو میں ایک یا دو اصحاب ایسے بھی ہوں جو مصنف ہونے کے علاوہ ناشر اور تاجر بھی ہوں لیکن ہر شخص ایسا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ خود ادبی ذوق اور تجربہ نہ رکھتا ہو۔ دیکھا جائے تو کتب فروشوں کا وجود کچھ کم قیمتی نہیں کیونکہ وہی آپ لوگوں تک علم کا خزانہ پہنچاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ مصنف اور مولف دنیائے ادب کے بادشاہ ہیں اور کتب فروش اُن کی دولتِ علم کے خزانچی اور کتابیں اُن کی دولت اور پڑھنے والے اُن کی فوج اور سپاہ، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف اور ناشر اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی حیثیت اور مرتبہ میں بہت زیادہ ذمہ وار شخصیتوں کے مالک ہیں"

"خوب"

"ہندوستان میں کم و بیش دو ہزار کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں۔ اور باہر سے بھی بے شمار آتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص خوشی اور آسانی کے ساتھ ہر سال اتنی کتابیں نہیں پڑھ سکتا اُس کے لئے صرف اتنا ہی ممکن ہو کہ وہ اُن میں سے چند پسندیدہ کتابوں میں دلچسپی لے۔

"جب سینکڑوں اور ہزاروں مصنف کتابیں لکھیں گے اور آپ لوگوں کے ذریعے دنیا کے ہر ملک ہر شہر اور ہر گوشہ میں پھیلیں گی تو آخر لوگ اُن کو کہاں تک خریدیں گے اور کہاں تک پڑھیں گے پھر اگر ایسی ناکارہ کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے تو اس کے ذمہ دار پبلشرز نہیں تو اور کون ہیں؟"

"جناب یہ تو ایک موٹی سی بات ہے کہ لکھنے والوں کی تعداد کے مقابلہ میں دنیا کی آبادی اور اُس آبادی میں پڑھنے والے بے شمار ہیں اور ناکارہ کتابوں کی اشاعت کے بارے میں آپ کو صحیح حالات اور واقعات کا علم نہیں۔ آپ پبلشرز کی اُن کوششوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ جو بیکار اور مہمل کتابوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے میں صرف کرتے ہیں ہوتا یہ ہے کہ ہر سال سینکڑوں مسودے جو شائع کرنے کے لئے مفت اور قیمتاً پیش کئے جاتے ہیں اُن میں سے بہت ہی کم کام میں آتے ہیں"

"آخر ان لکھنے اور پڑھنے والے حضرات کی تعداد میں زیادتی کا سبب"

"صاحب! اِس کا سبب پچھلے پچاس سال کی تعلیمی ترقی ہے، روز بروز اسکولوں، کالجوں اور طالبعلموں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے لائبریریاں اور ریڈنگ روم کھل رہے ہیں۔ بڑی عمر والوں، ملازمت پیشہ اور دستکار لوگوں کے لئے رات کے مدرسے کھُل گئے ہیں، رسائل اور اخبارات کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو گئی ہے"

"تو بس انہی سب چیزوں نے مطالعہ کا ذوق بڑھا دیا ہے۔"

"نہیں اِس کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کی تعداد بھی ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے جو قابل ہیں اور تصنیف و تالیف کے اہل۔ چونکہ اُن میں اپنے ذاتی خیالات، مشاہدات اور تجربات بیان کرنے کی صلاحیت ہے، اس

لئے ادبیات کا ذخیرہ اور آرٹ کا احساس برابر ترقی کر رہا ہے۔ یہ نوجوان طبقہ جن کے دماغ خیالات سے پُر ہوتے ہیں. نہایت شوق اور توجہ کے ساتھ لکھتے ہیں اور مخلصانہ طور پر محنت کرتے ہیں "

"لیکن اُن میں بہت سے مبتدی بھی تو ہوتے ہوں گے"

"یقیناً" اور اسی لئے اُن کے پے در پے تقاضوں کے باوجود اُن کی تصانیف شائع نہیں ہوتیں اور جو شائع ہو جاتی ہیں وہ بیکار ثابت ہوتی ہیں"

"لیکن یہ لوگ کس قسم کی کتابیں لکھتے ہیں جو غیر مفید اور بیکار ثابت ہوتی ہیں"

"یہی معمولی قسم کے جاسوسی ناول، عشقیہ و عریاں افسانے اور عامیانہ اشعار کے مجموعے، اور چونکہ اِن نئے لکھنے والوں میں سے بعض نے نمایاں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس لئے اُن کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے ہیں. ناول اور افسانے اس وقت بڑی تعداد میں چھپتے ہیں اور آئندہ بھی شائع ہوتے رہیں گے اس کے بعد تاریخ اور سوانح کی باری آتی ہے، سب سے آخر میں کہیں مذہبی کتابوں کا نمبر آتا ہے"

"گویا آپ کے خیال میں لوگ ماضی کو بھول کر حال سے بے خبر اور اپنے مستقبل سے بے پروا ہو رہے ہیں"

"جی ہاں رونا تو اسی بات کا ہے کہ پڑھنے والے زیادہ تر وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو اُن کو یا تو ہنسا سکیں اور یا غمزدہ کر سکیں اس کے برعکس عمدہ اور معیاری کتابوں پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے جو نسلِ انسان کے لئے زمینوں مکانوں اور زر و جواہر سے زیادہ قیمتی ہیں"

"تو پھر میرے خیال میں اچھی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع

کرنا چاہئے کیونکہ جب مارکیٹ میں عام مذاق کی کتابیں کم ہوں گی تو لوگ مجبوراً انہی اچھی کتابوں کو خرید کر پڑھیں گے"

"نہیں صاحب وہ مختصر تعداد میں شائع ہوتی ہیں اور اُن میں سے بھی اکثر کا ایک بار شائع ہونے کے بعد دوبارہ چھپنے کا نمبر نہیں آتا کیونکہ ناول اور افسانوں کے مقابلہ میں اِن کتابوں کی نکاسی ہو ہی نہیں سکتی"

"پھر تو اِن تصانیف کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے اور آپ لوگوں کو نقصان کا سراسر اندیشہ"

"خطرہ تو خیر کسی کو بھی نہیں تاجر تو اس لئے محفوظ رہتا ہے کہ وہ ہر کتاب کو اپنے تجربے اور اندازے کے مطابق اُسی قدر چھاپتا ہے جس قدر پبلک میں اُس کی مانگ ہوتی ہے، اب رہیں عمدہ کتابیں ان کو نہ کبھی خطرہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اعلیٰ تصانیف اپنے شوقینوں تک اِس طرح پہنچ جاتی ہیں کہ اُنھیں اس کا سان وگمان بھی نہیں ہوتا۔ ایمرسن لکھتا ہے کہ افلاطون کی کتابوں کو کبھی مٹھی بھر سے زیادہ خریدار میسر نہیں آئے اور اُن کی فروخت سے لاگت کے سوا اور کچھ نہ نکل سکا لیکن پھر بھی وہ مقبولِ عوام اور زندہ جاوید ہیں۔ خطرہ اصل میں اُن کا ہے جو اعلیٰ اور معیاری کتابیں نہیں پڑھتے جو ہر وقت اور ہر موقعہ پر اُن کے کام آنے والی ہیں"

"لیکن جن لوگوں کے علم میں مفید اور معیاری کتابیں ہیں وہ انھیں کیوں نہیں پڑھتے"

"اس لئے کہ یا تو وہ شخص صحیح ادبی ذوق کا مالک نہیں، اپنی مقدارِ علم اور سطحی مذاق کے مطابق سہل اور دلچسپ مضامین کی کتابیں خرید کر پڑھتا ہے جو ذرا اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں شوخ اور خوشنما بھی ہوتی ہیں۔

یا پھر وہ اتنا غریب ہوتا ہے کہ اُس کو کوئی معیاری اور قیمتی کتاب خریدنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا"

"تو آپ اِس کے لئے کوئی مناسب انتظام کیجئے جیسا کہ دوسری ولائیتوں میں ہو رہا ہے"

"جناب اِس کے لئے ضرورت ہوگی کافی روپے کی، اِس کے لئے ضرورت ہوگی قابل لکھنے والوں کی اور سب سے زیادہ ضرورت ہوگی ایسے پڑھنے والوں کی جن کا علمی مذاق اونچا ہو، یقیناً پھر لوگوں کے دلوں میں مطالعہ کا حقیقی شوق پیدا ہوگا اور وہ صحیح معنوں میں مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں گے اور آئندہ جو جو تصانیف سامنے آئیں گی وہ بلاشبہ مفید اور کارآمد ہوں گی"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ معمولی کتابوں کی بجائے ایک اچھی کتاب پڑھنی چاہیئے اور جو شخص تالیف و تصنیف کا اہل ہو اس کو لازم ہے کہ وہ ایک بہترین تالیف یا تصنیف پیش کرے لیکن کیا انسان کی زندگی کا مقصد صرف مطالعہ ہی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کتابوں کا پڑھنا خالی اوقات کو مصروف یا زیادہ سے زیادہ پُر لطف بنانا ہوتا ہے"

"واہ جناب واہ آپ نے بھی کمال کر دیا مطالعہ کا مقصد محض تفریح طبع نہیں البتہ بعض کتابیں خاص خاص موقعوں پر تفریح کی خاطر لکھی جاتی ہیں سو اُن کا سرسری مطالعہ کافی ہے لیکن باقاعدہ مطالعہ سے جو سب سے بڑا فائدہ ظہور میں آتا ہے وہ تہذیبِ نفس اور تربیتِ دماغ ہے"

"نفس کی تہذیب اور دماغ کی تربیت سے آپ کو کیا ملے گا"

"اول تو آپ مکمل انسان ہو جائیں گے۔ انسانی ذمہ داریوں کو بخوبی محسوس کرنے لگیں گے اور زندگی کے متعلق آپ کے مختلف نظریات سلجھ

جائیں گے۔ پہلے زمانے کے تمام تجربات اور مشاہدات جو صدیوں کا نتیجہ ہیں۔ جن کو حاصل کرنے کے لئے عمر نوح بھی کافی نہیں سب آپ کے سامنے آجائیں گے“

تو کیا جو شخص مطالعہ نہیں کرتا اور اپنی ذاتی معلومات پر بھروسہ کرتا ہے وہ ماضی کی برکات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا، کیا وہ بالکل اندھیرے میں رہتا ہے“

یقیناً ایسے شخص کے لئے وہ زمانہ جو اس سے پیشتر تھا خالی اور بے معنی ہے جبکہ اور لوگوں نے زندگی بسر کی ہے معاملات کو سوچا ہے تکلیفیں برداشت کی ہیں اور اُن سے ایسے نتیجے نکالے ہیں جو انسان کی بھلائی اور ترقی کے لئے ضروری ہو سکتے ہیں“

ہاں تو پھر یوں کہئے کہ کتابوں کو گہری نظر سے پڑھنا اُن کے معانی اور مطالب کی تہ کو پہنچنا اور مختلف مسائل پر تنقید کرنے کا نام مطالعہ ہے“

”بیشک، ورنہ یہ کیسے معلوم ہوتا کہ یہ انسانی تہذیب جو آج اپنے ظاہر وباطن میں مکمل نظر آرہی ہے کس طرح وجود میں آئی اور اُس مسلۂ ارتقا کی سچائی کیوں کر واضح ہوتی۔ جس کی رُو سے انسان مختلف مقامات سے گذر کر انسانی درجے کو پہنچا۔ کتابوں سے ہم قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا سبب معلوم کر سکتے ہیں۔ اُن کی ترقی و تنزل کا سبب معلوم کرسکتے ہیں۔ اُن کے اقبال وزوال کا سبب معلوم کر سکتے ہیں۔ کتابیں ہم کو پہلے زمانے کے قابل اور لائق بزرگوں کی صحبت اور ہمراہی کا شرف بخشتی ہیں۔ اُن کی بدولت ہم سعدی، اور خیام، کبیر اور تلسی داس، شکسپیئر اور ملٹن سے گویا روبرو گفتگو کر سکتے ہیں، اُن کی نصیحتیں، معرفت سے لبریز جذبات اور فلسفیانہ خیالات روح کو تازگی بخشتے ہیں۔ الغرض بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں

حکمار کے نادر خیالات، عالموں کے علمی انکشافات اور جہاں دیدہ لوگوں کے ذاتی تجربے ہماری زندگی کے لئے نہایت مفید اور کار آمد ہیں اور یہی ہماری دُنیا کو ایک بہتر دنیا اور ہمارے مستقبل کو ایک روشن، شاندار اور کامیاب مستقبل بنا سکتے ہیں۔"

"میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا، آپ ایک روشن خیال تاجر اور ادب کے خدمت گذار ہیں، آپ کا علمی ذوق بھی بلند ہے اور یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ مطالعہ زندگی کی ضروریات میں سے ہے اور اُس کا ایک خاص مقصد بھی ہے، اب مجھے اجازت دیجئے، آداب عرض"

ہندوستان کے متعلق

بابر کا نظریہ

علمِ تاریخ کا جغرافیہ سے بہت بڑا تعلق ہے۔ کسی ملک کے تاریخی حالات جاننے اور سمجھنے کے لئے اُس ملک کا جغرافیہ جاننا نہایت ضروری ہے کیونکہ اُس کی قدرتی تقسیم اور آب وہوا کا اثر اُس کے باشندوں کے طریقِ معاش اُن کی ترقی و تنزل اور تمدن و معاشرت پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ کا شوق روز بروز بڑھ رہا ہے گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں مورخوں نے ہندوستان کی تاریخ قدیم و جدید کی تحقیقات کر کے علمِ تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اِس وقت بھی ہمارا موضوع زیرِ بحث ہندوستان ہی کے متعلق ہے۔ اِس مختصر مضمون میں یہ بتانا ہے کہ ہمارے ہندوستان جنت نشان کے بارے میں بابر بادشاہ نے کیا رائے قائم کی اور وہ ٹھیک تھی یا غلط۔

بابر نے ہندوستان کا مفصل بیان اپنی مشہور اور ہر دلعزیز کتاب تزک بابری میں لکھا ہے۔ ہندوستان کے جغرافیہ کے علاوہ اُس میں اُس کی زندگی کے ۸۹۹ سنہ سے ۹۳۶ ہجری تک کے تقریباً تمام حالات و واقعات موجود ہیں۔ بابر نے اسکو اپنی مادری زبان ترکی میں لکھا تھا اور شہنشاہ اکبر

سکے سنِ جلوس ۳۴ مطابق ۹۹۸ ہجری موافق ۱۵۹۰ عیسوی میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں نے ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ بابر کا طرزِ ادا اور اندازِ بیان اِس غضب کا ہے کہ اگر مطالعہ کیجئے تو کہیں افسانہ کا مزہ آتا ہے۔ کہیں تاریخ کا لطف، کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے کسی بڑے محقق جغرافیہ داں کا جغرافیہ پڑھ رہے ہیں۔ جن ملکوں میں وہ رہا لڑا بھڑا وہاں کے رزم و بزم کے نقشے اِس طرح کھینچے ہیں گویا آپ اُن واقعات کو بچشمِ خود ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ پہاڑوں کا نقشہ برف گرنے کا منظر، سبزہ کا لہلہانا، دریاؤں اور نہروں کا بہنا، باغوں کی بہار، جنگلوں کی کیفیت نباتات اور حیوانات کے متعلق مفصل حالات اور اُن کے واسطے حکمتیں اور ترکیبیں لکھی ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو قدرتی اشیاء کے بیان کرنے کی ایک قدرتِ خداداد حاصل تھی۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ ہندوستان کے متعلق بابر کی رائے ہماری آپ کی رائے سے زیادہ اچھی نہیں لیکن اِس سے ہم کو بدظن ہونا نہیں چاہیئے کیونکہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سُنا اور جو کچھ اُس کے تجربے میں آیا وہی اُس نے لکھا اور وہ بھی اپنے اہلِ ملک کی فہمائش کے لئے جن کو اُس نے اپنا جانشین چھوڑا۔

جن لوگوں نے عہدِ مغلیہ کی تاریخ اور بالخصوص بابر کا حال پڑھا ہے اُن کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ بابر نے صرف ۴۸ برس کی عمر پائی اور ۳۸ سال حکومت کی لیکن ابتدائے حکومت کا بیشتر حصہ لڑائی اور خانہ بدوشی کی حالت میں گذرا۔ کبھی وہ اپنا آبائی دارالسلطنت سمرقند فتح کر لیتا ہے تو کبھی اپنے باپ کے ملک فرغانہ سے بھی محروم ہو کر

اپنی جانِ عزیز بچانے کے لئے پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں اور چٹانوں پر بھاگتا نظر آتا ہے۔ کبھی وہ کابل کے مرغزاروں اور باغوں میں مزے اڑاتا دکھائی دیتا ہے تو کبھی برف کاٹ کر فوج کے لئے راستہ بناتا نظر آتا ہے کبھی سر پر تاج کبھی ہاتھ میں مٹی کا کاسہ کبھی تخت اور کبھی بوریا بھی نہیں۔ اگر اس کو کھانے اور سونے کا موقع ملا تو وہ کہتا ہے آج میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور نیند بھر کر سویا۔ سچ پوچھو تو رنج و مصیبت میں عیش و عشرت کرنا صرف بابر ہی کا کام تھا۔

اس کی اِس غیر مستقل اور ہر گھڑی اور ہر آن بدلنے والی زندگی سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کو ہندوستان میں رہنے اور ہندوستانیوں سے ملنے جلنے اُن کے ملت و اخلاق پرکھنے اور رسم و رواج کو معلوم کرنے کا بہت ہی کم موقع ملا۔ اگر اُس کو مفصل واقعات اور حالات کا علم ہوتا تو یقیناً اُس کے دل و دماغ پر ہرگز ایسا نقش نہ بیٹھتا جس کو ہم آج پڑھ کر حیرت و افسوس کرتے ہیں۔ بہر حال اب ہمیں اِس ضروری تنقید اور تبصرے کے بعد یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اُس نے اپنے اُس پُر آشوب اور مختصر زمانے میں کیا کیا دیکھا وہ لکھتا ہے:۔

ہندوستان نہایت وسیع آباد اور سیر حاصل ملک ہے اور ایک عجیب جگہ واقع ہوا ہے۔ اس کا کچھ حصہ اقلیم اوّل میں شامل ہے اور کچھ حصہ اقلیم دوم اور سوم میں۔ ہندوستان ہماری ولایت سے بالکل جدا حیثیت رکھتا ہے پہاڑ، دریا، جنگل، جانور، نباتات، آدمی، زبان، ہوا اور مینہ سب چیزیں مختلف ہیں۔ کوہستان کشمیر میں جو لوگ آباد ہیں اُن کو کس کہتے ہیں "میر" سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑ

کے ہیں۔ لہٰذا "کہس" اور "میر" مل کر "کھمیر" ہوگیا۔ چونکہ اہلِ ہند شین کو شاید سین بولتے ہیں اس لئے کشمیر سے کھمیر بن گیا ورنہ فی الاصل کشمیر ہی ہے۔ اِس پہاڑ کی اجناس مُشک نافہ۔ قرناس بحری، زعفران سیسہ اور تانبہ ہیں۔ ہندو اِس کو "سوالک پربت" بھی کہتے ہیں یعنی سوا لاکھ پہاڑوں والا پہاڑ۔ اس پہاڑ پر بارہ مہینے برف رہتی ہے، اِس کے علاوہ اور پہاڑوں اور دریاؤں کا بیان اس نے ایسا ہی لکھا ہے جیسا کہ آجکل جغرافیوں میں لکھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں متعدد شہر ہیں لیکن ایک دوسرے سے بالکل مختلف اتنے زیادہ شہر اور ایسا نمایاں اختلاف جو ہندوستان کے شہروں میں ہے۔ کسی اور ولایت میں نہیں۔ اِس ملک میں یہ عیب ہے کہ سوائے دریاؤں کے آبِ رواں یعنی نہریں نہیں ہیں۔ لیکن جہاں نہر جاری ہے وہاں کی زراعت اور باغات سرسبز ہیں۔ بڑے بڑے درختوں کی پودھ کو برس دو برس رہٹ یا چرس سے پانی دیا جاتا ہے جہاں وہ بڑے ہوئے پھر پانی دینے کی ضرورت نہیں، البتہ ترکاریوں وغیرہ کو پانی دیتے رہتے ہیں۔

ہندوستان کے شہر بہت غلیظ ہیں۔ تمام زمینیں ایک وضع کی ہیں۔ اکثر باغات میدان میں بغیر دیوار کے ہوتے ہیں۔ اکثر دریاؤں اور ندیوں کے کنارے اور جہاں گھاس ہوتی ہے برسات میں دلدل ہو جاتی ہے کہیں کہیں کنوئیں اور تالاب ہیں جن میں پانی بھرا رہتا ہے اور برسات میں اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ تمام شہروں کی گذرِ اوقات اسی پانی پر ہے ہندوستان میں شہروں اور دیہاتوں کا آباد ہونا اور اجڑنا بھی ایک

معمولی کھیل ہے۔ بڑے سے بڑے شہر میں جہاں لوگ برسوں سے آباد ہوں اگر اُس کو چھوڑنے اور وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوں تو ایک آدھ ہی روز میں اِس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ اُن کی بُود و باش کا کوئی آثار اور نشان باقی نہیں رہتا اور اگر آباد ہونا چاہیں تو اُن کو نہر کھودنے کی ضرورت ہے نہ بند باندھنے کی نہ مکان بنانے کی اور نہ دیواریں چُننے کی۔ بس لوگ جمع ہو گئے۔ ایک معمولی سا حوض یا کنواں کھود لیا۔ بانس پھونس اور درختوں کی لکڑیوں سے جھونپڑیاں بنالیں اور فراغت پائی۔ آن کی آن میں ایک گاؤں یا چھوٹا سا ایک شہر آباد ہو گیا۔

ہندوستان کے مخصوص جانوروں یعنی چرندوں پرندوں اور درندوں میں ہاتھی۔ گینڈا۔ نیل گائے۔ کوتہ پا۔ کلہرہ یا کالا ہرن۔ بارہ سنگھا بندر لنگور نیولا یا موش خرما۔ گلہری۔ مور۔ طوطی۔ مینا۔ لوحہ یا بوقلموں تیتر۔ کنجل۔ بل ٹیکار۔ شام۔ بودنہ۔ خرچیل۔ حرّر۔ باغری قرا۔ وتنگ سارس۔ سکسار۔ بکلک۔ بُرک کلاں۔ مرغابی۔ رنج۔ سارا درالہ قرغہ پراغ۔ چمگادر۔ غکہ یا مُنیا۔ مُمولہ۔ مکر کرچہ۔ کوئل اور آبی جانوروں میں شیر آبی۔ سیسار۔ دریائی سوّر۔ کہلش۔ تنہ۔ گھڑیال۔ کِلکہ ماہی پینڈک کا احوال نہایت مفصل اور خوب واضح لکھا ہے۔ اِس وقت اِن کا حال معلوم کرنا بیکار ہے۔ کیونکہ ہم میں سے اکثر لوگوں کو ان کی بابت بہت کچھ معلوم ہے۔

ہرن، تیتر، کبک دری، بودنہ۔ حرّر۔ مرغابی اور مچھلی کے گوشت کو نہایت عمدہ اور مزیدار بتایا ہے۔ مور کے گوشت کو بھی لذیذ لکھا ہے۔ لیکن اِس کے بارے میں کہتا ہے کہ اونٹ کے گوشت کی طرح مور کا گوشت

بھی ذرا کراہیت سے کھایا جاتا ہے۔

نباتات میں آم۔ کیلا۔ املی یا خرماے ہندی۔ مہوبہ۔ کھرنی جامن۔ کمرک۔ کٹھل۔ بڑھل۔ بیر۔ کروندہ۔ نیسالہ۔ گولر۔ آملہ چیرونجی۔ کھجور۔ ناریل و تاڑ۔ نارنج۔ لیمو۔ ترنج۔ سنترہ۔ کلکل۔ امل بید نارنگی وغیرہ کا ذکر تحریر میں لایا ہے۔ پھلوں میں اُس نے سب پھلوں پر آم کو ترجیح دی ہے۔ آم کے علاوہ باندے کے بیر۔ کلکتے کے کیلے۔ حاجی پور کی نارنگی اور ترنج کے شربت کو نہایت عمدہ اور میٹھا بتایا ہے، نارنج۔ کمرک۔ نیسالہ۔ کلکل۔ امل بید کو بہت رسیلا اور لذیذ۔ آملہ کے مربّہ کو مفید۔ اور لیمو کے عرق کو زہر کا تریاق لکھا ہے۔ املی کے درخت کو خوبصورت۔ مہوبہ کی لکڑی کو مکانوں کے لیے کار آمد۔ کٹھل کو اوجھڑی کی مانند بدصورت اور بڑھل کو صرف بدمزہ بتایا ہے۔ تاڑ کے پتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ کہ اُن کی لمبائی تقریباً گز بھر ہوتی ہے۔ ہندی تحریریں اکثر انہی پتوں پر لکھی جاتی ہیں اور انھیں پتوں کے بالے بنا کر کانوں میں بھی پہنے جاتے ہیں۔

پھولوں میں جاسوں یا کریل۔ کنیر۔ کیوڑا۔ کیتکی۔ چنبیلی۔ چمپا۔ گلاب اور نرگس کو بیان کیا ہے۔ کہتا ہے کہ کنیر کی بُو نہایت بھینی بھینی۔ چمپا کی بہت مست اور چنبیلی کی بہت تیز ہے۔ کیوڑے کی بُو بھی نہایت لطیف ہے لیکن صورت عجیب طرح کی ہے۔ کریل کی کلی ایک بار کھلتی ہے پھر اُس میں سے ایک چیز دل کی ہم شکل نکلتی ہے پھر اُس کی پنکھیاں کھل کر پھول ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہے۔

ہندوستان میں تین فصلیں ہوتی ہیں۔ چار مہینے گرمی چار مہینے برسات اور چار مہینے جاڑا۔ مہینوں کے نام یہ ہیں۔ چیت۔ بیساکھ۔ جیٹھ۔ اساڑھ۔ ساون بھادوں۔ کوار۔ کاتک۔ اگھن۔ پوس۔ ماہ۔ پھاگن۔ دنوں کے نام یہ ہیں:۔
اتوار۔ سنیچر یا سوموار۔ منگلوار۔ بدھوار۔ برستھ وار۔ سکروار

اہلِ ہند نے دن کے ساٹھ حصے کئے ہیں۔ ہر حصہ کو گھڑی کہتے ہیں۔ پھر رات و دن کے چار چار حصے کئے ہیں اور ہر حصہ کو "پہر" کہتے ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں لوگ مقرر ہیں اُن کو "گھڑیالی" کہتے ہیں۔ اِن لوگوں کا کام صرف یہ ہے کہ وقتِ مقررہ پر گھڑیال بجا کر لوگوں کو وقت سے مطلع کرتے ہیں کہ اِس وقت دن یا رات کی کونسی گھڑی اور پہر ہوئی۔

ہندیوں نے اپنے وزن بھی آپ مقرر کئے ہیں جو رتی سے سو من یعنی ایک "مینا سے" تک پہنچتے ہیں۔ موتیوں اور جواہرات کو "ٹانک" سے تولتے ہیں۔ اِسی طرح عدد کی مقدار بھی خوب مقرر کی ہے جو سینکڑہ سے سو پدم یعنی ایک سنکھ تک پہنچتی ہے۔ عددوں کا اِس تعداد پر مقرر کرنا اہلِ ہند کے مالدار ہونے کی دلیل ہے۔

ہندوستانی اکثر بُت پرست ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہندو کہلاتے ہیں۔ اکثر مسئلہ تناسخ کے قائل ہیں اور اپنے اپنے قبیلہ کا نام جد اجداد رکھتے ہیں۔ اہلِ حرفہ اپنا آبائی پیشہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں حُسن و لطافت بہت کم ہے۔ عقل و فہم بھی زیادہ نہیں رکھتے۔ میل جول کی خُو بُو ادب اور لحاظ مروت و مہربانی جیسی کہ ہونی اور برتنی چاہیئے وہ نہیں پائی جاتی۔ اپنے ہنر اور پیشے کی ترکیبوں سے زیادہ واقف نہیں۔ اچھا گھوڑا

در عمدہ گوشت نہیں ملتا۔ انگور، خربوزے اور میوے خراب ہوتے ہیں
نہ برف ہے نہ ٹھنڈا پانی۔ بازاروں میں جو کھانے اور روٹیاں بکتی ہیں
وہ سب خراب۔ حمام۔ مدرسہ۔ شمع، مشعل اور شمعدان کا نام نہیں۔
اِن کی بجائے ایک دِیوٹ ہوتا ہے۔ اِس کو چراغدان پر رکھتے ہیں۔ کپّی
سے تیل ڈال کر بتی جلائی جاتی ہے۔ اِس قسم کے سینکڑوں دِیوٹ ہوتے ہیں
بادشاہوں اور امیروں کو اگر رات کے وقت شمع کی ضرورت ہو تو بھی دیا تو
دِیوٹ چیکٹ بھرا ہوا آتا ہے۔ بڑے دریاؤں اور ندیوں کے علاوہ تمام نالے
گرمی اور جاڑے میں خشک پڑے رہتے ہیں۔ باغوں اور مکانوں میں نہریں
نہیں ہوتیں اور نہ عمارتوں میں کوئی ہوا کا انتظام اور نہ کوئی حُسن و خوبصورتی
عوام لنگوٹا باندھتے ہیں اور ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ عورتیں دھوتی باندھتی
ہیں آدھی کمر میں اور آدھی سر پر ڈال لیتی ہیں۔ غرض ہندوستان میں اگر
کوئی خوبی ہے تو یہ کہ ایک وسیع ملک ہے۔ سونا چاندی بہت ہے۔ برسات
میں بارش خوب ہوتی ہے۔ جہاں پانی کی بوند نہ ہو وہاں ایک مرتبہ
دریا بہنے لگتا ہے ابارش کے بعد ہوا نہایت ٹھنڈی اور لطیف ہوتی
ہے۔ لیکن وہ بھی مرطوب۔ بارش کے زمانے میں ہمارے ملک کی کمان
سے تیر اندازی نہیں ہو سکتی۔ ایک کمان ہی کا یہ حال نہیں ہوتا بلکہ تمام
چیزوں میں سیل دوڑ جاتی ہے۔ برسات کے علاوہ گرمی، جاڑے میں بھی
خوب ہوائیں چلتی ہیں اور آندھیاں بھی اس غضب کی آتی ہیں کہ ایک
آدمی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا۔

دوسری خوبی ہندوستان میں یہ ہے کہ یہاں ہر قوم ہر مذہب ہر
ملت ہر پیشے کا آدمی بکثرت پایا جاتا ہے۔ اور ہر کام اور ہر صنعت کے

لئے ہزاروں آدمی موجود ہیں لیکن ہر صاحبِ حرفت وہی کام کرے گا۔ جو اُس کے باپ اور دادا کے وقت سے ہوتا آیا ہے۔

یہ ہے وہ مختصر اور جامع جغرافیہ اور ہندوستان کے باشندوں اور مقامات وغیرہ کے حالات جو بابر نے تزکِ بابری میں لکھے۔ اب اہلِ نظر اور اہلِ انصاف یہ خود فیصلہ کریں کہ بابر نے جو کچھ مشاہدہ کیا اور جو کچھ اُس کے تجربہ میں آیا اور اُس کی بناء پر اُس نے جو رائے ہندوستان کے لئے قائم کی اور اپنا نظریہ پیش کیا وہ اُس میں حق بجانب تھا یا نہیں۔

بابر کو ہندوستان کی گرمی اور آندھی نے بہت ستایا۔ اُس کو نہروں کے علاوہ عمارات اور باغات کے نہ ہونے کی سخت شکایت تھی۔ اس لئے اُس نے ایران اور قسطنطنیہ سے اعلیٰ درجے کے صناع اور معمار بلاکر ہندوستان میں مغلیہ فنِ تعمیر کی بنیاد رکھی۔ آگرے میں چار باغ لگائے اور کئی نہریں جاری کیں۔ جو مدتوں تک اُس کی یاد دلاتی رہیں گی۔

ادبی چور

چور سے مطلب وہ چور نہیں جو پچھلی رات چوری کے ارادے سے لک چھپ کر مکان میں داخل ہوتا ہے اور صاحب مکان اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لئے یا چور کو پکڑنے کے واسطے چور چور کہہ کر چیختا ہے۔ آپ سوتے سوتے جاگ اٹھتے ہیں، عورتوں اور بچوں کی اُس کے ڈر سے گھگی بند جاتی ہے اور نہ حضرتِ ذوق کے بقول ؎

گُشتہ ہوں میں اس ناوک دزدیدہ نظر کا ٭ جانے کا نہیں چور مرے زخم جگر کا

اس چور کا تعلق عاشقوں کے زخم جگر سے ہے، نہ اس چور کا تعلق اس چور سے ہے جس کا اشارہ حضرت ناسخ نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

بے سبب آنکھیں نہیں مجھ سے چُراتا وہ صنم
کچھ نہ کچھ میری طرف سے اُسکے دل میں چور ہے

اور نہ یہ وہ شاطر چور ہے جو حضرتِ برق کا دل لے کر مُکر گیا تھا وہ فرماتے ہیں ؎

کھیل تو دیکھو وہ چھُوا تا ہے لیکر ہاتھ میں
دِل نہیں قبضہ میں گویا گنجفہ کا چوُر ہے

نہ یہ عورتوں کی مہندی کا چور ہے جو ہاتھ پاؤں میں مہندی لگانے کے بعد رہ جاتا ہے، نہ چور بالو ہے، وہ ریت جسے دُور سے دیکھو تو پانی کا دھوکا ہوتا ہے نہ چور بدن ہے جس کا موٹاپا اور فربہی پوشیدہ ہو، نہ چور پیٹ ہے، وہ ڈبا جس کا مداری تماشہ کرتے وقت چالاکی سے ایک رُخ خالی اور دوسرا ابھرا ہوا دکھاتے ہیں۔ نہ چور پیسہ ہے جو خاک میں گر کر مشکل سے پایا جاتا ہو۔ نہ چور نالا ہے جس کا قفل نظر نہ آتا ہو۔ نہ چور لیک ہے جس پر چور خفیہ اور بے کھٹکے چلتے ہوں۔ نہ چور خانہ ہے جو صندوقچے میں زر و جواہر رکھنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے، نہ چور زمین ہے جس میں دلدل کے سبب اندر دھنس جانے کا اندیشہ ہو، نہ چور کچہری ہے جہاں سراغ رسانی کے لئے خفیہ پولیس رہتی ہو، نہ چور کھڑکی ہے کہ وقت ضرورت کود پھاند کر کہیں بھاگ جاؤ، نہ چور محل ہے جس میں بیاہتا بیوی سے چھپا کر لگا رکھا ہو۔ نہ چور مونگ ہے جو مونگ یا اُڑد کی دال میں پکنے کے بعد گلنے سے رہ گیا ہو، نہ چور بازار ہے جہاں اُچکے اور بدمعاش چوری کا مال فروخت کرتے اور دوکاندار کوڑیوں کے دام خریدتے ہوں۔

پھر آخر یہ کون چور ہے، ضرور کوئی دھاڑی چور ہوگا، چور کی داڑھی میں تنکا یہ مثل تو آپ نے سُنی ہوگی بس یہی اُس چور کی پہچان ہے، اصل میں ہمارا مطلب ادبی چور سے ہے، ادبی چوروں کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اس سے قبل کہ آپ اُن سب سے دو چار ہوں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ اُس چوری کی تعریف سُن لیں جو ادبی چوری کہلاتی ہے، ادبی چوری اصل میں علم ادب کی چوری ہے اور اس کا تعلق نظم اور نثر دونوں سے ہے۔

"علمِ ادب میں چوری اور سرقہ کی تعریف یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے الفاظ اور معانی کو تبدیل کر کے اپنے اشعار میں استعمال کرنا اور اُن کی تشبیہات اور استعارات کو اپنے کلام میں جگہ دینا اِس کی چار قسمیں ہیں :-

پہلی قسم کا نام اِنتحال ہے یعنی کسی کے شعر کو بغیر کسی تبدیلی کے اپنے نام سے پیش کرنا۔ دوسری قسم کو سلخ کہتے ہیں اِس لفظ کے لغوی معنی کھال کھینچنے کے ہیں یہاں یہ مقصد ہے کہ ایک مطلب کو دوسرے الفاظ میں ادا کرنا۔

تیسری قسمِ الہام ہے۔ اس کے لغوی معنی کسی چیز کا ارادہ کرنا اور سرقاتِ شعر میں اِس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ معنی تو وہی رہیں لیکن عبارت اور طریقہ بدل دیں۔

چوتھی قسم نقل ہے یعنی ایک شاعر کسی دوسرے شاعر کے معنی لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجائے چنانچہ ترجمہ بھی جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتا ہے اِسی کے ماتحت آتا ہے۔

یہ چاروں قسمیں سرقہ سے متعلق تھیں لیکن اِسی سلسلہ کی ایک کڑی اور ہے جسے توارد کہتے ہیں یعنی اصطلاحِ شعر میں ایک مضمون کا دو شخصوں کے ذہن میں آنا یا دو شاعروں کا ایک ہی مصرع یا شعر نظم کر جانا بشرطیکہ ایک کو دوسرے کے کلام کا علم نہ ہو یہ توارد کیوں کر وقوع میں آتا ہے ذرا اِسے بھی سمجھ لیجئے۔

فرض کیجئے کہ آپ کو اس وقت فکرِ سخن مطلوب ہے جس ردیف اور قافیہ میں آپ غزل کہنی چاہتے ہیں۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کی کوشش و جستجو یہ ہے کہ کسی طرح کوئی نیا اور اچھوتا خیال سُوجھ جائے تو ایک عمدہ شعر ہو جائے ورنہ پھر اُسی خیال کو نظم کرنا پڑے گا کہ جس معنی کا وہ قافیہ بظاہر

حامل ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے توارد کی بنیاد پڑتی ہے۔ کیونکہ اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ہم اچانک وہ شعر یا اُسی شعر کا مضمون جسے ہم نے کسی دیوان یا رسالہ میں پڑھا تھا یا کسی سے سنا تھا اپنے ہی فکر کا نتیجہ سمجھکر بجنسہٖ یونہی نظم کرجاتے ہیں۔ اور اگر اُس خیال کا ماخذ یاد آبھی گیا تو پھر مجبوراً اُس سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اِس اِستفادے کے لئے انتہائی احتیاط اور حزم سے کام لیا جاتا ہے اور لینا چاہئے تاکہ سخن گو اور نقاد دونوں اُس سے قطعی بے خبر رہیں کہ اِس شعر کا ماخذ فلاں شاعر کا فلاں شعر ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی رائے میں اِس اِستفادے کو عین سرقہ اور اِستفادہ کرنے والے کو قطعی مجرم گردانتے ہیں۔ اِن حالات کا شکار اکثر نوآموز اور مبتدی ہی ہوتے ہیں۔ حکیم آغا جان عیش کی غزل کا ایک شعر ہے۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اِسے بھی گزار دے

بعینہٖ اِسی مضمون کا ایک شعر استاد ذوق کا بھی ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اُسے ہنس کر گزار دے

دونوں اشعار استادوں کے ہیں کبھی کہ اِس توارد میں شبہ کی گنجائش اور سرقہ کی شکایت نہیں ہاں اگر یہی توارد کسی استاد یا مبتدی کے درمیان ہونا یا اب ہو جائے تو بغیر تحقیق سرقہ کا الزام غریب مبتدی ہی پر لگایا جائے گا حالانکہ اشعار کا سرقہ صرف اُن ہی اشعار کے حق میں کہا جاسکتا ہے جو بغیر کسی تبدیلی کے اپنے نام سے پیش کئے جائیں یا اُن میں محض ایک دو لفظوں کی کمی کی گئی ہو یا وہ اپنی ہی زبان کے کسی مشہور شعر سے ماخوذ ہوں اور ماخوذ

ہونے کے باوجود اپنی فصاحت و بلاغت میں اصل سے کمتر ہوں، ایسی صورت میں خواہ توارد ہی کیوں نہ ہوا ہو، اس شعر کو غزل سے خارج کر دینا ہی لازم ہے اور اگر اپنے ماخذ سے بلند ہو تو چونکہ وہ ادب میں ایک اضافہ ہے۔ اِس لئے اُس کو قائم رکھنا اور اپنا قرار دینا ہرگز کوئی گناہ اور عیب نہیں، خود آپ ہی انصاف سے کہیئے کہ وہ شاعر جو اتفاق سے ایک ہی زمین ایک ہی ردیف اور ایک ہی قافیہ میں فکرِ سخن کر رہا ہو۔ کیونکر ایک بالکل نیا اور اچھوتا خیال آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہے' ایسی حالت میں وہ دانستہ یا نادانستہ دوسروں کا خیال مستعار لینے کے لئے اتنا ہی مجبور اور محتاج ہوگا جتنا اردو کے شعرائے متقدمین شعرائے فارس کا مضمون اخذ کرنے کے لئے معذور اور ضرورتمند تھے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ دورِ حاضر کے اکثر شعرا انگریزی نظموں کا اردو میں آزاد ترجمہ کرتے ہیں۔ الغرض کسی کے شعر کو بغیر کسی تبدیلی یا معمولی تغیر و تبدل کے اپنے نام سے پیش کرنا تو فی الواقعی سرقہ ہے اور اس کا مرتکب اخلاقی اور قانونی دونوں حیثیتوں میں یقیناً مجرم ہے لیکن کسی کی زبان سے کچھ سُن کر اور کسی کتاب سے کچھ پڑھ کر اُس بات کو یا اُس خیال کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر پہلے سے بہتر اور عمدہ پیش کرنا یا ایک زبان کی چیز کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا چوری اور نقل نہیں ہے' اِستفادہ بہر صورت ضروری اور ناگزیر ہے۔

اب آپ کو سرقہ کی تعریف اور اُس کی مختلف قسمیں معلوم ہوگئیں اور سرقہ اور توارد کا باہمی فرق بھی سمجھ میں آگیا۔ یقیناً اِن اصولوں کی مدد سے آپ ادبی چوروں کو پکڑنے اور اُن کی چوریوں کو پبلک میں بے نقاب کرنے میں حسبِ دلخواہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔ آئیے اب اُن لوگوں سے ملاقات

بھی کریں ۔

پہلے ذرا ان صاحب پر نگاہ ڈالئے آپ نے "پہلے مسلمان" کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر حضرتِ حالی مرحوم مغفور کی روح پر احسان اور قوم کی اصلاح فرمائی ہے، طبیعت تو دیکھئے کس قدر بے باک اور کلام کس درجہ مصلحانہ پایا ہے ۔

جب اُمت کو سب مل چکی حق کی نعمت ٭ ادا کر چکی فرض اپنا رسالت
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی خدمت ٭ پیارے نبی کو کیا یاں سے رخصت
تو اسلام کی وارث ایک قوم چھوڑی
کہ دُنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

اِس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرے میں خدمت کی بجائے حجت ہے اور دوسرا مصرع اصل مسدس میں اس طرح ہے ع

نبی نے کیا خلق سے قصدِ رحلت

خلیفہ تھے اُمت کے ایسے نگہباں ٭ ہو گلے کا جیسے نگہبان چوپان
سمجھتے تھے ذی علم و جاہل کو یکساں ٭ نہ تھا عبد و حُر میں تفاوت کسی آں
کنیز اور آقا تھیں آپس میں ایسی
کہ ماں جائی بہنیں ہوں آپس میں جیسی

دوسرے شعر میں ذی علم و جاہل کی بجائے مسدس کے اصل الفاظ قومی و مسلم ہیں اور کسی آں کی بجائے "نمایاں" کا لفظ ہے۔ اِس بند کے آخری شعر کے دونوں مصرعے تو اِس خوبی سے بدلے ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہ نوجوان شاعر شاید تذکیر و تانیث کے زمرہ سے الگ کوئی تیسری جنس ہیں۔ اصل شعر یوں ہے ؎

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی ؏ زمانے میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

الغرض آپ نے اصل مسدس حالی کے آٹھ بند یا چوبیس اشعار کو لفظ بہ لفظ نقل کر کے کہیں کہیں کسی مصرعے میں ایک دو الفاظ کا تصرف فرما کر اپنی نظم کو مکمل فرمایا ہے۔

نظم کا نمونہ تو آپ نے ملاحظہ فرمالیا اب فرا نثر کی ایک نظیر بھی دیکھ لیجئے۔ ایک مضمون نگار کا مضمون ایک مشہور رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ کچھ مدت بعد ایک دوسرے رسالہ میں تمام و کمال یہی مضمون ایک دوسرے صاحب نے اپنے نام سے شائع کر دیا۔ اصلی اور نقلی دونوں تحریریں پڑھئے، عبارت کے علاوہ قصے کے ہیرو اور ہیروئن کے ناموں کو بھی دھوکا دینے کے لئے تبدیل کر دیا ہے۔

۱

"زکیہ جو نظرِ لطف کی خواہاں اور محبت نے ادنیٰ انداز کی آرزومند تھی کہ وہ شوکت اپنے بے پرواہ شوہر کے سامنے اپنے وارداتِ قلب اپنے جذباتِ رقیق کی نمائش کرے یہ سُنکر دم بخود ہوگئی"

"رضیہ جو رفاقت کی ایک نظر اور محبت کا ایک لمحہ چاہتی تھی۔ اور اس لئے چاہتی تھی کہ وہ حامد کو اپنے بے پرواہ شوہر کو کچھ اپنے وارداتِ قلب سنائے۔ کچھ اپنے جذباتِ دل عرض کرے کچھ اپنے حسیات و تاثرات پیش کرے دم بخود رہ گئی"

۲

"لیکن آہ! اگر ایک مجبورِ محبت نے تمہیں جو اک ذرا چھولیا تو کیا تمہیں اسی طرح جھڑکنا۔ غصہ میں بھر کر بے قابو ہو جانا اور

میرے بے گناہ ہاتھ کو غایت بے رحمی سے مروڑ دینا مناسب تھا؟"
لیکن آہ! محبت کی مجبوری نے اگر ایک دل ہلا دینے والے تخیل سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ فرطِ محبت سے بیتاب ہو کر تم سے اپنا دکھڑا بیان کیا تو کیا تمہیں تلخ کامی سے پیش آنا چاہئے تھا اور باندیوں طرح جھڑکنا مناسب تھا، غصے میں بھر کر بے قابو ہو جانا اور نگاہ قہر آلود سے دیکھنا جائز تھا؟"

۳

"ہر وقت گھروں میں گھسے رہنا اور جاہل عورتوں میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنا مہذب دُنیا اور تعلیم یافتہ طبقے کا دستور نہیں وہ اپنی فرصت کی ساعتوں کو بہترین مشاغل میں گذارتے ہیں"
"ہر وقت گھروں میں گھسے رہنا اور بیوقوف عورت ذات کے پاس بیٹھ کر وقت ضائع کرنا جاہل ہندوستانیوں میں رائج ہے، مہذب دنیا وقت کی قدر دان ہے اور وہ اپنا وقت بہترین مشاغل اور مصروفیات میں گذارنا پسند کرتی ہے"
یہ ایک نئی نویلی مضمون نگار خاتون ہیں، مضمون نویسی کا نیا نیا شوق ہے۔ اپنی سہیلی کو ایک خط لکھ رہی ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ عبارت رنگین اور شوخ ہو، وہ اپنی اِس کوشش میں ایک حد تک کامیاب بھی ہیں کیونکہ اُن کی ہر بات سے ایسا ہی اظہار ہو رہا ہے۔
صبح کا سہانا وقت ہے، بالائی منزل کے ایک کمرے میں ایک مکلّف پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ ہوا کی آمد و رفت کے لئے کھڑکی کھُلی ہوئی ہے دوات کی پہلی بدبودار سیاہی پھینک کر رنگین اور روشن سیاہی ڈالی ہے۔

قلم کا نب بھی بدلا گیا ہے، فیروزی رنگ کا نیا کاغذ ہے، کچھ مسکرانے اور گنگنانے کی سی کیفیت طاری ہے۔ ابھی صفحہ کے آغاز پر مقام و تاریخ لکھا ہے، القاب زیرِ غور ہے، لیجئے "عزیز سلمیٰ" لکھدیا گیا، القاب لکھتے ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ رسمی طور پر سلام لکھوں یا شوقِ ملاقات کا اظہار کروں، کچھ سوچ کر لکھا "شوقِ ملاقات" لکھتے لکھتے زیادہ محبت کا اظہار مقصود ہوا، "ہزاروں ارمان" کے الفاظ اور بڑھا دیئے گئے۔ اب اصل خط شروع ہوتا ہے، پیرایۂ آغاز، تمہید و انجام، مضمون اور مطلب تمام باتیں دماغ میں گھوم رہی ہیں۔ قلم انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دبی ہوئی ہونٹوں سے لگی ہے۔ آنکھیں صفحۂ کاغذ پر جمی ہوئی ہیں۔ دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ اُسی وقت دماغ میں پہنچ کر ٹکرایا۔ قلم کے ذریعہ فوراً صفحۂ کاغذ پہ آیا۔ ابھی قلم نے صرف یہ الفاظ "تمہارا خط ملا" لکھے تھے کہ ہوا کے ایک تُند اور گستاخ جھونکے سے سنوارے اور بنائے ہوئے بال پریشاں ہوگئے حنائی انگلیوں نے بالوں کو درست کیا، ہوا پھر چلی، گیسو پھر بکھر گئے۔ پھر بنایا پھر بگڑ گئے، غضب ہوا دماغ میں آیا ہوا مضمون یک لخت دھیان سے اُتر گیا، بہت سوچا کچھ یاد نہ آیا، آخر اِس خیال کو ترک کرکے دوسرا مضمون گانٹھنا شروع کیا۔ دل کو اُلجھن اور دماغ کو تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ طبیعت میں ایک انتشار پیدا ہوگیا۔ سوچا کچھ لکھا کچھ اور لکھ کر بھی کاٹ کاٹ دیا۔ اسی کاٹ چھانٹ میں کافی وقت گذر گیا۔ آخر اُٹھ کر الماری کھولی۔ دس پندرہ منٹ غالب کے دیوان کی ورق گردانی کرکے چند اشعار انتخاب کئے گئے اور ایک کاغذ پر نقل کر لئے۔ پھر ایک ناول اور دو تین رسالے الٹ پلٹ کر دیکھے جہاں کہیں مفید مطلب عبارت نظر آئی۔

وہیں سے اُس کا کوئی فقرہ لکھ لیا اس طرح دس پندرہ سطروں کا مواد جمع کر لیا، اب پلنگ دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھیں، القاب و آداب سے پہلے ہی فراغت مل چکی تھی، ذرا غور کر کے فقروں کو مقدم و موخر کرتے ہوئے اور درمیان میں دو تین اشعار پھنسا کر اچھا خاصا ایک خط لکھ مارا۔

یہ ایک نو آموز شاعر ہیں۔ کل شہر میں ایک مشاعرہ ہونے والا ہے، اُس کی تیاری میں مصروف ہیں، الماری کھولے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیوان نکال رہے ہیں۔ اُن کے دادا مرحوم بڑے پایہ کے شاعر تھے اُن کے دیوان سے چند اشعار نقل کئے ہیں اُن کو لکھ کر اپنے استاد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کریں گے۔ ظاہر ہے ایسے چوٹی کے اشعار کو استاد بغیر اصلاح کچھ پڑھنے کی اجازت دے دیں گے۔ استاد، شاعر تو ضرور ہیں لیکن زبردستی کے استاد مشہور ہیں، اپنے متعدد شاگردوں کو غزلیں تقسیم فرما رہے ہیں جو اپنے نام و تخلص سے بڑے جوش اور طمطراق سے پڑھیں گے، آپ جب ایک دو اچھے اشعار سنیں گے تو بے ساختہ تعریف کرنی پڑے گی، شعر پڑھنے والے صاحب عجز و انکساری کے ساتھ فرمائیں گے "یہ استاد کا فیضان ہے، اُن کی جوتیوں کا صدقہ ہے" دوسرے استاد بھائی موقعہ پا کر چیخیں گے "واہ واہ واہ! سبحان اللہ کیا شعر فرمایا ہے آپ نے واللہ جواب نہیں ہے۔ قلم توڑ دیا ہے زبان ہو تو ایسی ہو، کیا حقیقت فرما رہے ہیں آپ، کمال ہے کمال بھئی! کتنا مرصع خیال ہے" وہ جواباً سر بہ قد کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے "آپ کا حسنِ ادب ہے احسن اخلاق ہے۔ سخن فہم حضرات ہی کے لئے شعر کہتا ہوں، آداب عرض ہے آداب عرض، ذرہ نوازی ہے، قدر دانی ہے، آداب عرض ہے آداب عرض"۔

یہی صاحب دوسرے دن صبح کو ایک شادی کی محفل میں سہرا پڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہ انہی سہروں میں سے ایک سہرا ہے جو اُن کے اُستاد متعدد بار اپنے شاگردوں کو مختلف شادی کی تقریبوں میں پڑھنے کے لئے دے چکے ہیں۔ آج بھی یہ دو چار نام اور ایک دو اشعار کی معمولی سی تبدیلی کے بعد کاغذ پر چھپا ہے اور ہمارے نوجوان زبردستی کے شاعر اُس کو بے تکلف گا گا کر پڑھ رہے ہیں۔

یہ صاحب واعظ ہیں اور لیڈر بھی۔ فن تقریر اور چند مواعظ کی کتابیں ہر وقت اُن کے گھر میں موجود رہتی ہیں، سال میں شہر کے اندر جب کبھی کوئی عظیم الشان جلسہ ہوتا ہے یا حسن اتفاق سے دو چار مرتبہ کہیں کے کوئی بڑے مولوی صاحب شہر میں آ دھمکتے ہیں تو یہ چند لیڈروں کی تقریریں اور مولوی صاحبان کے پند و نصائح اور بیان خفیہ پولیس کے ایک مخبر رساں کی طرح چپکے چپکے کاغذ پر لکھ لیتے ہیں اور کچھ مدت بعد کسی دوسری جگہ پہنچ کر وہ لکھی اور رٹی ہوئی تقریریں بے تکلف دہراتے ہیں۔

یہ ایک مشہور و معروف ادیب ہیں، ویسے تو تین چار سو ناولوں کے بادشاہ مشہور ہیں۔ کیونکہ وہ تمام ناولوں کو اپنی ہی تصنیف بتاتے ہیں۔ حالانکہ وہ تمام انگریزی ناولوں کا ترجمہ ہیں اور اُن میں سے بھی بیسیوں ناول ایسے ہیں۔ جو پہلے شائع ہو چکے ہیں لیکن اب نئے نام، نئے سرورق اور نئے الفاظ کا جامہ پہن کر نئے روپ میں سامنے آ رہے ہیں۔

یہ ایک مترجم ہیں اور ایک مشہور مصنف کی ایک کتاب کا حال ہی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ترجمہ تو کر لیا لیکن دل ہی دل میں کڑھ رہے ہیں۔ کہ کاش میں ہی اس کتاب کا مصنف ہوتا اور یہ مقالات میرے ہی مطالعہ

کا نتیجہ اور تجربہ کا نچوڑ ثابت ہوتے، پھر مصنف کی حیثیت سے سامنے آنے ہوئے بھی گھبراتے ہیں، اس لئے کتاب کے دیباچہ میں کچھ اس قسم کی گول مول عبارت لکھتے ہیں

"اِن مقالات کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طبع زاد ہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہیں بلکہ بشیتر خیالات محض میرے مطالعہ کا ایک عکس ہیں۔ اگر یہ مفید ثابت ہوئے تو میں سمجھونگا کہ میری کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔"

یہ ایک نئے رسالے کے ایڈیٹر ہیں، دو تین پرچے شائع ہو چکے ہیں اُن کے پاس جہاں روپے کی کمی ہے وہاں مضمون نگاروں کا بھی کال ہے اشاعت کی تاریخ سر پر آپہنچی ہے، رسالہ کو بہر حال مضامین سے پُر کرنا ہے آخر کچھ پُرانے اور کچھ نئے رسالوں اور اخباروں سے چند مضامین پھاڑ کر کاتب صاحب کے حوالے کئے تاکہ وہی اُن کے رسالے کی زینت بن سکیں اسی سلسلہ میں آپ نے ایک دو مقامی رسالوں کے خریداروں کے پتے بھی اُن کے دفتر والوں سے مل جل اُڑا لئے ہیں اور نہایت اطمینان کے ساتھ نمونے کے پرچے بھیجے جا رہے ہیں، اُن کے رسالے کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اوروں کا ہوتا ہے کہ خریداروں تک پہنچنے سے بیشتر درمیان سے اُڑا لئے جاتے ہیں شکایتی خطوط وصول ہوتے ہیں پرچے دوبارہ بھیجے جاتے ہیں اور جب نیا پرچہ شائع ہوتا ہی تو قندرتاً یہ نوٹ لکھتا ہی

"ڈاک کے ڈاکو۔ رسالہ دفتر سے ہر ماہ ۱۵ رتاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر آپ کو رسالہ وقت پر نہ ملے تو اپنے ہاں کے پوسٹ ماسٹر سے شکایت کیجئے اور تحقیق فرمائیے اور ہمیں بھی لکھئے تاکہ ڈاک کے اُن ڈاکوؤں کا پتا چلانے کے لئے ہم کوئی قدم اٹھا سکیں۔ دفتر کو اس سلسلہ میں ہر ماہ بہت بڑا

نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے ، "منیجر"

یہ کتابوں کے مشہور پبلشر ہیں ، آپ کو اپنی ادبی تجارت چمکانے اور روپیہ کمانے کے بہت سے گُر اور ٹکلے معلوم ہیں ، آپ کسی شہرۂ آفاق مصنف کی جو اتفاق سے مرحوم ہو چکا ہے ۔ کوئی ابتدائی اور غیر معروف سی کتاب کو نیا نام دیکر ایک نئی سج دھج کے ساتھ شائع کرتے ہیں ۔ اور پڑھنے والے اپنے دلپسند مصنف کے نام کا فریب کھا کر کتاب پر کتاب خریدتے ہیں ۔

یہ صاحب مطالعہ کے بڑے ہی شوقین ہیں لیکن حالت یہ ہے ۔ کہ خرید کر پڑھنا حرام سمجھتے ہیں ۔ جس لائبریری یا ریڈنگ روم میں چلے جاتے ہیں تو گویا اُن پر احسان کرتے ہیں ، اِس احسان کا عیوض حاصل کرنے کی اُن کے نزدیک نہایت آسان صورت یہ ہے کہ اخباروں اور رسالوں کے عمدہ مضامین ، کتابوں کی ضروری تصویریں اور نقشے پھاڑ کر جیب میں رکھ لیں ۔ موقعہ لگے تو ایک دو کتابیں بھی اُچکا لائیں ورنہ اُن کے دوست زندہ وسلامت ہیں ۔

یہ ادبی چور اپنے ملنے والوں کے کتابی دوست بن کر اُن کے پاس جائیں گے ۔ اُن کے علم و قابلیت کی تعریف کریں گے ۔ کتابوں کے عمدہ انتخاب اور کثیر تعداد پر خوشی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک دو کتابوں کی شدید اور فوری ضرورت بتائیں گے ۔ وہ غریب خواہ کتنے ہی حیلے وحوالے کیوں نہ کرے لیکن یہ کسی نہ کسی طرح اُن سے مستعار ورنہ آخر درجے کھسکا کر لے ہی آئیں گے ۔ پھر وہ کتاب اُن کی اور ہزار بار اُن کی ، اور علم اور مطالعہ تو گویا اُنھیں میراث میں ملا تھا ۔

سفید پوش
طبقے کی زبوں حالی

ہماری سوسائٹی بحیثیت مجموعی اعلیٰ و ادنیٰ صرف دو طبقوں پر منقسم ہے لیکن اُس مستقل مخالفت اور مُسلسل جنگ کو جو کبھی پوشیدہ اور کبھی کُھلم کھلا امیر و مزدور کے درمیان جاری رہتی ہے ہمارے اِس زمانہ کے متوسط طبقے نے جسے عرفِ عام میں سفید پوش کہا جاتا ہے بہت زیادہ نمایاں کر دیا ہے، کیونکہ وہ مزدور سے زیادہ اِس کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔

ایک مزدور کو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں جتنی دیر کام کرنا پڑتا ہے اُس کا وہ وقت مقرّر ہے، اُس مقررہ عرصہ میں اُس کو جو کام جس مقدار میں کرنا ہے وہ بھی اُس کو معلوم ہے اور اُس کی اُجرت سے بھی آگاہ ہے، اِس نظام کے ماتحت وہ اپنی زندگی بُری یا بھلی برابر گذارے جاتا ہے اِس لئے کہ وہ مزدور ہے اور آخر وقت تک مزدور ہی رہنا چاہتا ہے وہ اپنی فرصت کے مختصر لمحات میں بھی مزدوروں ہی کے ساتھ مل بیٹھ کر ہنستا اور بولتا ہے یہاں تک کہ قومی میلوں مذہبی تہواروں اور شادی غمی کے موقعوں پر بھی اُس کی شرکت اُنہی

کے ساتھ ہوتی ہے اور آخرکار ایک دن اس زمانے کی اوسطِ عمر کے خلاف' پہلے یا بعد' میں ضرور مرجاتا اور پھر صورتِ حال کے مطابق اُس کی اولاد یا گھر کے دوسرے آدمی اُس کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں. گویا مزدور کی زندگی کا ماحصل پیدا ہونا، کام کرنا اور مرجانا' اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اِس کے برخلاف متوسط درجے کے لوگوں میں سے اکثر یا تو سرکاری یا نیم سرکاری اِداروں یا بڑی بڑی پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازم ہیں اور باقی صنعت وحرفت کے مختلف شعبوں میں تجارت کرتے ہیں۔

ملازموں کی بہ نسبت تاجروں کی گذر اوقات اگر زیادہ کساد بازاری نہ ہو تو خاصی اچھی ہو جاتی ہے کیونکہ اُن کے ہاتھوں اپنے یا پرائے مال اور روپے کا لین دین برابر جاری رہتا ہے لیکن خدانخواستہ اگر ملک میں جنگ چھڑ جائے یا رعایا کی اتفاقیہ بغاوت سے بدامنی پھیل جائے یا بارش نہ ہونے سے قحط پڑنے لگے یا تجارتی نرخ اور اشیاء کی پیداوار اور مانگ میں یکایک غیر معمولی فرق آجائے یا ڈاکو ڈاکہ ماریں یا آگ لگ جائے یا زلزلہ سے تباہی آئے تو ایسی حالت میں ایک متوسط طبقے کا معمولی تاجر جو اپنی کم سرمائیگی کی وجہ سے اپنی دوکان اور مال کا بیمہ بھی نہیں کرا سکتا۔ وہ صرف دیوالیہ ہی نہیں بلکہ پیسے پیسے اور کوڑی کوڑی سے محتاج ہو جاتا ہے،

ایک مزدور اور تاجر کی زندگی سے ملازم کی زندگی بالکل مختلف ہوتی ہے وہ نہ تو تاجر کی طرح تجارت کی اُلجھنوں اور لین دین کی مصیبتوں میں پڑنا چاہتا ہے اور نہ ہی وہ مزدور بننا پسند کرتا ہے حالانکہ وہ

خود ایک مزدور ہی ہوتا ہے۔ گو ذرا اُونچے درجے کا سہی۔ یہاں تک کہ وہ کسی ایسی نیچی سوسائٹی میں بھی نہیں جاتا جس سے اُس کی موجودہ حیثیت کے وقار کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہو بلکہ جوں جوں اُس کی آمدنی میں قدرے قلیل اضافہ ہوتا ہے۔ اُسی قدر اُس کی شہری زندگی کا معیار اور سوسائٹی کا مذاق اونچا ہوتا جاتا ہے، شہرت و نمود کی خواہش بڑھتی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک شہری ہونے کی حیثیت سے شہری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے لیکن اپنی بساط اور حیثیت سے بڑھ کر اُس میں حصّہ لینا ہر بات میں امیروں کی سی طرز اور روش اختیار کرنا اور اُن کے دوش بدوش چلنا اُس کے لئے اُس کی آمدنی کبھی اجازت نہیں دیتی، آمدنی کم اور اخراجات زیادہ ہونے ہی کی وجہ سے ہمارا سفید پوش طبقہ ہمیشہ تنگدستی سے دوچار اور بعض اوقات مفلسی کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائے تھے بلکہ ہمیشہ شہر اور اُس کے ماحول اور اپنی خاندانی رسومات اور روایات کو اُس کا قصوروار اور ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

وہ اپنا شوق پورا کرنے کی خاطر یا دوسروں کی برابری اور ہمسری کے لئے یا "پدرم سلطان بود" کو شیخی کی بجائے واقعہ ثابت کرنے کے لئے ایسے کام کرتا ہے یا کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے جو بعض اوقات دوسروں کے لئے تو مضحکہ خیز لیکن خود اپنے لئے جان کا جنجال اور ندامت کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ وہ شہر کے نزدیک ایک نئی اور صاف ستھری بستی میں اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی پر ایک مناسب رقم خرچ کر کے آسانی سے گذار سکتا لیکن وہ وہاں رہنے کی بجائے شہر کے ایک مالدار ماحول میں گنجائش سے زیادہ کرایہ دے کر

میں رہتا ہے جو اُس کی حیثیت والوں کے لئے قطعی مناسب نہیں، صرف اِس لئے کہ اُس کا شمار بھی اُنہی مالدار لوگوں میں ہو جن کی رہائش اُس محلہ میں ہے۔

اِس کے برخلاف اگر وہ کسی رئیس خاندان کا فرد ہے اور اپنے قدیم آبائی مکان میں رہتا ہے جو پرانا ہوتے ہوتے اب کھنڈر ہو چلا ہے تو وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ مکان قرضہ کی بدولت رہن پڑا ہے اور کافی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے میں اُس کی مرمت نہیں کرا سکتا۔ یا میں اُس کو چھوڑ کر کسی اور جگہ کوئی اچھا مکان کرایہ پر نہیں لے سکتا۔ بلکہ اُس کا جواب یہ ہوگا کہ کرایہ کے مکان میں رہنا ہمارے خاندانی شعار کے خلاف ہے اور اہلِ محلّہ جو باپ دادا کے وقت سے ہمارے پڑوسی اور ہمسایہ چلے آتے ہیں۔ اُن کی جدائی کسی طرح گوارا نہیں۔

وہ اپنی ہر بات اور اپنے ہر فعل و عمل سے اپنی موجودہ شخصیت، ذاتی حیثیت اور سابقہ خاندانی شان و شوکت کو ظاہر کرنے اور برقرار رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ وہ اپنے خاندان کی خوشحالی کا تذکرہ بڑے فخر کے ساتھ کرے گا۔ آپ کو اپنے مکان کی سیر ایک تاریخی عمارت کی طرح اس طرح کرائے گا کہ اُس کے ہر گوشے اور ہر چیز کی تعریف ہو جائے جب ملاقاتی کمرے میں بیٹھے آپ اُس سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ وہاں کی چیزوں کو بھی نادر اور قیمتی بتائے گا —— یہ ایرانی قالین بہت پرانا اور قیمتی ہے، یہ آبنوسی تپائی میرے دادا کے وقت کی ہے اِن دونوں الماریوں کے بیچ میں طاق پر جو آئینہ آویزاں ہے وہ حلب کا ہے، میرے والد نے منگایا تھا۔ یہ ساگوانی الماریاں اور صوفے میرے

بنوائے ہوئے ہیں۔ آئیے یہیں بیٹھئے، لیجئے یہ سگرٹ پیجئے، مجھکو تو ان سگرٹوں کا تمباکو بالکل پسند نہیں، لکھنؤ سے خمیرہ منگایا کرتا ہوں، یہ حقّہ جس پر بدری کا کام ہو رہا ہے۔ اُس کی چاندی کی چلم میں جس وقت انگارے دہکتے ہیں اور کلابتو کی ریشمی پیچدار نے سے جب دہواں نکلتا ہے تو دماغ معطر ہوجاتا ہے۔ نوکر اِس وقت پھل لینے گیا ہوا ہے۔ ورنہ ابھی آپ کو پلواتا، کم از کم پان کی ایک گلوری تو کھائیے، اِس کا کتھہ اور چھالیہ دونوں کو خوشبو میں لبسایا گیا ہے، تشریف لے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر اور بیٹھئے نا، باتیں ہوں گی، کب کب آنا ہوتا ہے، اچھا خیر پھر بھی، آپ کچھ سردی تو محسوس نہیں کر رہے۔ میری کشمیری شال حاضر ہے اس قدر ملائم اور گرم ہے کہ ذرا بھی سردی نہیں لگتی، ہاں ایک مدت سے آپ نے ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ اب کے ساون میں نواب صاحب آ رہے ہیں، دعوت کا لطف تو او کھلے کے ڈاک بنگلے میں آئے گا۔ اس مرتبہ آپ بھی ضرور شرکت کریں، اچھا پھر کسی دن صبح یا شام کے وقت چائے ہی پر آجاؤ لیکن میں اب گھر پر بہت کم ملتا ہوں، لوگ ہیں کہ کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتے اُن کی سعی سفارش کی خاطر رات دن گورنروں اور حکاموں سے ملتا جلتا رہتا ہوں، بے لوث خدمت ہے میری تو، دوست احباب خطاب دلوانے کی فکر میں ہیں، ذرا اُن کو سمجھائیے نا، آخر یہ کیا لغویت ہے؟ بھئی اِس سال ہمارا بہت نقصان ہوا، وہ نئی بنک کھلی تھی نا، اُس کا دیوالہ نکل گیا، اپنا کچھ روپیہ تھا۔ سب ڈوب گیا۔ بڑی مشکل ہے صاحب! اچھا خدا حافظ۔

متوسط طبقے کے اس غریب اور مظلوم انسان کے پاس اگر اُس کی

خاندانی دولت ہوتی اور اگر وہ نہ ہوتی تو موجودہ آمدنی ہی خاطر خواہ ہوتی تو "پدرم سلطان بود" کا یہ سب تماشہ دکھانے اور خود تماشا بننے کی ضرورت کیوں پیش آتی، اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارا اسفید پوش طبقہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے، اُس کو روپیہ کمانے اور دولت جمع کرنے کا شوق نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس کے کام اور محنت کی رفتار جب تک اُس کے اعضا باقاعدہ کام دیتے ہیں۔ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ برابر جاری رہتی ہے لیکن وہ اپنی اُن ضرورتوں کو کہاں دفن کردے جو شہری زندگی نے اُس کے ساتھ وابستہ کردی ہیں۔

غریب متوسط گھرانوں کی دولت اُن کی اولاد ہوتی ہے۔ لیکن ایسی اولاد جس کی باقاعدہ پرورش کرنا اور تعلیم و تربیت دینا ماں باپ کے لئے دشوار بلکہ بلائے جان ہوجاتا ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ یتیم اور لاوارث بچوں کی دیکھ بھال شہر کے یتیم خانوں میں ہوجاتی ہے لیکن متوسط گھرانے کے بچوں کو کوئی اپنی متبنیٰ اولاد بھی نہیں بناتا اور اگر کوئی بنانا چاہے تو اُس کے ماں باپ اُس میں اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں، رہا اعلیٰ طبقہ اُس میں اول تو اولاد کثرت سے ہوتی ہی نہیں اور ہو بھی تو روپیہ پیسہ اتنا کافی ہوتا ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوسکتی ہے بلکہ بعض اوقات تو بعض گھرانوں میں دولت ہونے کے باوجود تعلیم نہیں دلائی جاتی، سرمایہ کے بل بوتے پر وہ تمام عمر ملازمت سے بھی مستغنی رہتے ہیں۔

دشواری تو متوسط الحال اور کثیر الاعیال لوگوں ہی کی ہے۔ جن کو بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے یا تو قرض لینا پڑتا ہے یا

اپنے گھر کی قیمتی اشیاء فروخت کرنی پڑتی ہیں یا پھر وہ اسکول کے فنڈ یا کسی قومی انجمن سے وظیفہ حاصل کرکے اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اُن کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے اور زیادہ روپے کی ضرورت ہوتی ہے لہذا وہ تھوڑی بہت قابلیت حاصل کرنے کے بعد ملازمت کے قابل ہو جاتے ہیں۔

جس طرح تعلیم سے فراغت پانا گویا ایک بڑی مہم کو سر کرنا ہے اسی طرح ملازمت کا حاصل کرنا بھی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، کیفیت ملاحظہ ہو کہ اِدھر تعلیم ختم ہوئی اُدھر ملازمت کی کوشش شروع ہوگئی، باپ نے اپنے اثر و رسوخ سے حتی الامکان اس میں حصہ لیا، نوجوان صاحبزادے نے دفتروں میں آسامیوں کا پتا چلانے کے لیے چکر کاٹنے شروع کیے جہاں گئے وہاں No VACANCY نو ویکنسی کا بورڈ دروازے پر آویزاں دیکھا اِدھر اُدھر بیسیوں محکموں میں عرضیاں ڈالیں کئی جگہ "انٹرویو" کیلئے بلائے گئے۔ جواب کا انتظار کیا کوئی نتیجہ نہ نکلا، آخر حکام رَس لوگوں کے پاس جانا شروع کیا، گھنٹوں انتظار کرنے کے بعد ملاقات اور گفتگو کی نوبت آئی۔ جھڑکیاں کھانے اور گھرکیاں سننے کے باوجود عاجزی اور خوشامد سے کام نکالا، سفارش ظہور میں آئی، خدا خدا کرکے ایک دفتر میں امیدوار ہوئے، مفت کی نوکری بھگتانے لگے۔ پھر دو چار عیوضیوں پر کام کیا، کچھ مدت بعد دفتر میں ایک نیا محکمہ کھلا، کلرکوں کی بھرتی کا وقت آیا، داخلے کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اپنی محنت اور سابقہ تجربہ کی بدولت کامیاب ہوگئے، ایک مرتبہ پھر سفارش کرائی، بالآخر باقاعدہ نوکر ہوگئے، چالیس پچاس روپے تنخواہ ملنے لگی۔ کوشش اور سفارش

کا سلسلہ جاری رکھا، کام کے ساتھ ساتھ حاکموں کی ناز برداری بھی کرتے رہے نتیجہ خوشگوار نکلا، جلدی ہی مستقل ہو گئے، اِدھر بوڑھے باپ کی پنشن کی آمدنی اُدھر اپنی تنخواہ، معقول رقم آنے لگی۔ گھر میں چاندنا سا ہو گیا، اچھی خاصی بسر ہونے لگی۔

گھر میں دو یا تین جوان بہنیں کنواری بیٹھی ہیں، شادی کی فکر درپیش ہے کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملتا۔ ایک دو باتیں سمجھ میں بھی آئیں تو مہر جہیز اور چڑھاوے کے قضیے نے معاملے کو طے نہ ہونے دیا۔ موقعہ ہاتھ سے جاتا رہا، ہندوستان میں یہ جہیز کا مسئلہ بھی بہت ہی ٹیڑھا ہے۔ عرب میں تو مہر کی رقم سے لڑکی کا جہیز اور چڑھاوے کا زیور تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں لڑکی کے والدین ہی حسب حیثیت جہیز تیار کرتے ہیں۔ انتہائی غریبی اور مفلسی کی وجہ سے اگر ماں باپ نہ دے سکے تب بھی شادی بخیر و خوبی انجام پا جاتی ہے لیکن اِس کے برخلاف ایک متوسط طبقے کی بنگالی لڑکی کی شادی ہونی۔ اُس وقت تک قطعی ناممکن ہے جب تک اس کا جہیز اس کے خاندانی رسم و رواج کے مطابق اور شایانِ شان نہ ہو۔ اِس کا نتیجہ بھی بعض اوقات خودکشی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے،

الغرض اگر گھر کا مکان ہوا تو اُس کو رہن رکھ کر لڑکیوں کی شادی کی جاتی ہے اور شادی سے لے کر چھٹی چھوچک تک کی تمام رسومات باقاعدہ پوری ہوتی ہیں، اگر قرض زیادہ نہ ہوا اور ادائیگی برابر ہوتی رہی تو فارغ ہو گئے۔ ورنہ اِسی اثنا میں صاحبزادے کی شادی قرار پا گئی۔ مزید رقم اُدھار لی گئی سر پر قرض کی ایک بھتی ہو گئی۔ اِدھر

نئی روشنی کی تعلیم یافتہ فیشن ایبل دُلہن گھر کی بہو رانی بن کر آئیں اور آتے ہی اپنی نئی نئی فرمائشات سے گھر کا ناطقہ بند کر دیا، چند روز میں گھر کے اخراجات سابقہ اصل اخراجات سے دوگنے ہو گئے۔ ایسے موقعوں پر اکثر دیکھا گیا ہے کہ صاحبزادے اپنے قرضدار اور مفلوک الحال ماں باپ کو بھول کر جورُو کے مُرید ہو جاتے ہیں انھیں وہ قرض بھی یاد نہیں رہتا، جو اُن کی شادی کے لئے اُن کے ماں باپ نے کیا تھا یہاں تک کہ ماں باپ کا حقِ خدمت بھی ختم ہو جاتا ہے، دونوں میاں بیوی علیحدہ ایک مکان میں رہنے لگتے ہیں، جیتے جی والدین سے ملنا عار اور عزیزوں کے ہاں آنا جانا ناگوار معلوم ہوتا ہے، آخر مکان نیلام ہو کر ساہوکار کی بھینٹ چڑھتا ہے اور چند ہی دن بعد مقروض ماں باپ اولاد سے رنجیدہ و مایوس سفرِ آخرت اختیار کرتے ہیں۔

بیٹے اپنی فضول خرچیوں اور گھر کے بے جا اخراجات کی وجہ سے قرض دار ہیں، بوٹی بوٹی قرض میں بندھ رہی ہے، اوّل خوشامد درآمد سے ورنہ پھر زبردستی بیگم صاحبہ کے زیورات یکے بعد دیگرے فروخت کرنے شروع کئے، پھر برتنوں اور کپڑوں کی باری آئی، چند دن میں سب جھاڑ پھونک کر بیٹھ گئے۔ کسی بات پر بیگم سے اَن بَن ہو گئی، اِدھر میاں اکڑے اُدھر بیوی تن گئیں، غرض خوب ہی ہوئی، میاں غصّے کے عالم میں بغیر کھانا کھائے بچوں کو پیار کئے دفتر روانہ ہو گئے، پیچھے بیگم صاحبہ نے ڈولی منگائی، بچوں کو ساتھ لیا اور یہ جا وہ جا، اپنے میکے آن اُتریں، دلہن کے ماں باپ کو یہ سب حال تو معلوم ہی تھا۔ اِس لئے پہلے تو لڑکی کی زبان اور بیوقوفی پر خفا ہوئے پھر پیار پُچکار کے کلیجہ سے لگا کر گھر میں بٹھا لیا۔ شام کے وقت میاں آئے

تو بیوی بچوں کو غائب اور گھر میں سناٹا پایا، پیروں تلے سے زمین ہی تو نکل گئی، ذرا سنبھلے اور سنبھل کر نوکر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ خفا ہو کر میکے چلی گئی ہیں، فوراً اکڑ گئے اور کہا "اچھا ہوا چلی گئیں دیکھیں تو کب تک نہیں آتیں، دو چار روز گذرے نہیں آئیں، ایک ہفتے کے بعد بیچے آئے گفت و شنید سے پتا چلا کہ وہ بغیر جاتے اور بلائے نہیں آئیں گی۔ آخر کار جا کر سسرال کی چوکھٹ کو چوما، اس طرح چلے آنے کی وجہ اور واپس نہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ دونوں طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ دراز ہوا خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ بیگم صاحبہ اگر میاں کی مفارقت سے بے چین اور اُن سے ملنے کی خواہشمند ہوئیں تو جلدی خاموش ہوگئیں، ماں باپ نے اشارہ پا کر سنجیدگی اور عقلمندی سے کام لیا، معمولی طور پر کہہ سُن کر اور آئندہ کے لئے ہدایت کے فرمان جاری کر کے بیٹی کو خاوند کے ساتھ رخصت کردیا اور اگر بیبیہ کا زعم ہوا اور ہوتے کچھ ایسے ویسے تو فوراً بات بڑھ گئی۔ اور معاملہ نے اتنا طول کھینچا کہ ساس سُسرے سے داماد کی جھک جھک شروع ہوگئی سینکڑوں طرح کے قصے قضیے، "ہماری بیٹی کو تم نے کیا دیا، کیا کھلایا، کیا پہنایا، اُس کے برتن اور زیور بیچ کر کھا گئے، ساس سسرے اُس کی جان کے لاگو تھے، نندیں اُس کے خون کی پیاسی ہیں، دیور بدزبانی سے پیش آتا ہے، ہماری بیٹی کی ہمارے گھر میں تو ایسی زبان نہ تھی، یہ سب باتیں تو اُس نے تمہارے گھر جا کر سیکھی ہیں، سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ تمہارا اب اُس پر ہاتھ بھی اٹھنے لگا ہے، تم کو یہاں کس نے بلایا تھا، کس نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے، کیوں شادی کی تھی، کیوں گو کھایا چھوڑ جاؤ، ہماری بیٹی کو، لیجاؤ اپنے بچوں کو، یہ عمر بھر یونہی بیٹھی رہے گی، اِس کو روٹی اِس کے

کتوں کو روٹی، تمہارا گھر تو اس کے لئے دوزخ سے بھی بدتر ہے، تمہارے ابا فلاں، تمہاری امّاں فلاں، تمہارا بھائی ایسا، تمہاری بہن ایسی، ذرا اپنے چھوٹے بھائی یا بہن کی شادی تو کرکے دکھاؤ" یہاں تک کہ نکھٹو، بزدل اور بے غیرت تک کہلائیے، یہ باتیں اور عجیب وغریب خطابات سن کر داماد سے بھی نہ رہا گیا۔ ادب ولحاظ کو بالائے طاق رکھ کر جو جی میں آیا وہ بھی بکنے لگے نوبت بہ ایں جا رسید کہ انھوں نے طلاق طلب کی، یہ تاؤ میں تو تھے ہی سوچا نہ سمجھا، جھٹ طلاق دے بیٹھے، بچوں کو لے گھر پر چلے آئے، پھر کا مقدمہ چلا، ہارے، تنخواہ پہلے ہی قرض میں کٹ رہی تھی اس کے علاوہ کوئی اور اثاثہ نہ تھا کیا دیتے؟، غرض اس سے بھی صاف چھٹکارا ملا۔ اس کے بعد میاں بیوی تو شاید ہی ایک دوسرے کو یاد کرتے ہوں لیکن ہاں اپنی اور اپنے ماں باپ کی خوفناک غلطیوں پر وہ کبھی کبھی گھنٹوں غور کیا کرتے ہیں جس کا نتیجہ شروع سے آخر تک ہر ایک کی تباہی اور بربادی ہی بربادی تھا۔ اور وہ معصوم اور بے گناہ بچے جب باپ دفتر میں ہوتا ہے تو محلہ کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اپنا وقت برباد کیا کرتے ہیں۔

سفید پوش طبقے کی یہ صرف چند مشکلات ہیں جن کا تعلق اُن کی تعلیم وتربیت ملازمت، شادی بیاہ اور ازدواجی زندگی سے ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی اور بہت سی مشکلات ہیں جن کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اِس طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر خدا کی مشیت کا پردہ درمیان سے اُٹھ جاتے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ قدرت کا ظلم ہے کہ اُس نے ہم کو اِس متوسط طبقے میں پیدا کیا ؂

قسّام نے لکھ کر میری قسمت میں اسیری
فرمایا مزاج اس کا امیرانہ بنا دو

دِلّی کی مُہر کنی

مُہر کنی کا تعلق فنِ خطّاطی یا کتابت سے ہے اور کتابت آج سے کئی ہزار برس قبل اُس وقت ایجاد ہوئی تھی جب حضرتِ انسان نے حیوانیت اور بربریت کو چھوڑ کر انسانیت اور آدمیت کے دائرے میں قدم رکھا اور تہذیب و تمدن کی ابتدائی بنیادیں قائم ہونے لگیں، نسلِ انسان بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے دُور دراز مقامات پر آباد ہونے لگی، دُور ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے کے حال کی فکر درپیش ہوئی۔ آہستہ آہستہ قومی حالات و واقعات نے کروٹیں بدلیں، مختلف انقلابات رُونما ہوئے، اِن نِت نئے واقعات کو آئندہ کے لئے محفوظ رکھنا ضروری سمجھا گیا۔

آج کل کی طرح قدیم زمانے میں چھاپے خانے نہ تھے۔ بلکہ خطّاطی کا دور دورہ تھا، شاہی دفترِ انشاء میں خوش نویسوں کے سوائے کسی دوسرے کا تقرر ناممکن تھا، انہی خوش نویسوں میں سے ایک فرمان نویس یا سند نگار کہلاتا جو بادشاہ کے خطوط اور فرمان اُٹھا کرتا تھا۔ ارکانِ حکومت کے احکام نئی عمارتوں کے کتبے، چاندی سونے کے کام کی مُنقش وصلیاں جن پر آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی، حکیمانہ اقوال، قطعات و رباعیات

درج ہوتی تھیں) اور قدیم وجدید تصنیفات کی کتابت دوسرے نامور اور مشہور خطاط کیا کرتے تھے، انہی چیزوں میں مہر کنی بھی شامل تھی۔

یہ صحیح صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ مہر کب ایجاد ہوئی اور کس نے ایجاد کی لیکن یہ بات ضرور تحقیق ہے کہ اِس کا تعلق زمانۂ قدیم سے ہر ملک، ہر قوم اور اُس کے ہر بادشاہ سے رہا ہے اور یہ کہ خطاطوں ہی میں سے مہر کن بھی ہوا کرتے تھے چنانچہ۔

اہلِ عرب مہر کو اپنی زبان میں	خاتم	KHATAM	کہتے ہیں
اہلِ فارس "	نگین	NAGIN	"
اہلِ فرانس "	کاشیٹ	CACHET	"
اہلِ جرمن "	پیٹ شافٹ	PETCHAFTE	"
اہلِ ٹرکی "	مہرلی	MUHRLE	"
اہلِ اسپین و پُرتگال "	سیلس	SELLOS	"
اہلِ اٹلی "	سِگلی	SIGILLI	"
اہلِ روم "	سِگلئم	SIGILLUM	"
اہلِ انگلستان "	سِیل	SEAL	"

اور تامل میں MUTRA مترا یا MUDRA مُدرا کہا جاتا ہے۔

مہر کی حیثیت صرف مہر تک ہی محدود نہ تھی بلکہ بعض لوگ اِسے بطور انگوٹھی اپنی انگلی میں بھی پہنتے تھے، عیسائیوں میں شادی بیاہ کے موقعے پر دولہا دلہن ایک دوسرے کو پہناتے ہیں، یہ رسم اب بھی اسی طرح ادا ہوتی ہے۔ اہلِ یونان و روما کی مہروں پر عجیب و غریب قسم کے نقش و نگار اور شکلیں کندہ ہوتی تھیں جن سے اُن کے علم اور مذاق کا پتا چلتا تھا، یونانی

علم الاصنام کی کتابوں میں ایک ایسی مہردار انگوٹھی کا ذکر ہے جس کو بلقراط نامی جادوگر نے سمندر میں پھینک دیا تھا اور پھر جادو کے زور سے ایک مچھلی نے باہر آکر اُسے زمین پر آگل دیا تھا، مہر سلیمانی اس لئے مشہور تھی کہ اُس پر اسم اعظم کندہ تھا اور اُس کی وجہ سے تمام جن وپری، دیو اور آسیب حضرت سلیمان کے تابع تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ بعض کے نزدیک آسیب کے خلل سے محفوظ رہنے کے لئے مہر کا مصرف محض تعویذ تھا جس پر اللہ کا نام یا حروفِ ابجد میں کوئی آیتِ قرآنی درج ہوتی اور وہ اُسے اپنے گلے میں پہنتے، مہرِ سلیمانی کا نقش SWASTIKA صلیب یا نازی حکومت کے نشان سے ملتا جلتا تھا۔

مہر کی اہمیت کا اندازہ مزید اس سے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے معاملات اور لین دین میں اس کی ضرورت لاحق تھی۔ مہر کسی شخص کی ذاتی تحریر اور اُس کے دستخط سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی، جس کاغذ پر لگائی جاتی وہ عدالتی دستاویز سمجھا جاتا، قیمتی اشیاء کو محض ایک ڈوری سے باندھ کر گرہ کے مقام پر مہر لگا دیتے تو پھر اُس کے لئے قفل اور کنجی کی ضرورت باقی نہ رہتی اور غیر کی دست برد سے محفوظ ہو جاتی۔ جب تک خاندانی شجرے اور محضر نامے مہروں سے مزیّن نہ ہوتے کسی کے نسب کی تصدیق اور خاندانی عظمت تسلیم نہ کی جاتی۔ تمام اُمرا کے پاس اپنی مہریں ہوتی تھیں لیکن یہ مہریں وہ خود استعمال نہ کرتے بلکہ اُن مہروں کے خفیہ محافظ اُن کے خاص اور معتمد مہر بردار ہوتے۔ ہر مہر بردار کے پاس مہریں رکھنے کے لئے ایک ریشمی خریطہ یا تھیلی ہوتی۔ یہ خریطہ سینہ کے مقام پر اُن کے لباس کے نیچے پوشیدہ ہوتا، جب ضرورت ہوتی خریطہ

نکال کر مہریں لگاتے، کسی کو اپنی مہر سپرد کرنے کے یہ معنی ہوتے کہ اُس نے اپنے اختیارات اپنے مہر بردار کو سونپ دیتے ہیں۔

اُمورات سلطنت میں خواہ وہ فوجی ہوں یا شہری جب تک اجرائے احکام اور داد خواہی کے فرامین پر اور اُن خطوط پر جو بادشاہ کی جانب سے دوسرے شاہانِ ممالک کے نام روانہ کئے جاتے مہر نہ لگتی وہ نامکمل رہتے اور کوئی کارروائی عمل میں نہ آتی۔

شاہانِ فارس کے ہاں باقاعدہ تین مہر بردار ہوتے اور تین ہی قسم کی مہریں بھی تھیں جو فوجی، شہری اور غیر ملکی اُمورات کے کاغذات پر لگائی جاتی تھیں۔ اِن کے علاوہ دو مہریں اور تھیں، یہ صرف اُن کاغذات پر لگتی تھیں۔ جن کا تعلق براہ راست محل شاہی کے معاملات سے ہوتا تھا۔ یہ سب مہریں محل میں ایک بکس کے اندر بند کی جاتیں، پھر اس بکس پر خود بادشاہ اپنی ایک مُہر ثبت کرتا، ایک ہفتہ تک تمام کاغذات جمع ہوتے رہتے، جمعہ کے دن اُن سب پر مہریں لگائی جاتیں

اسلام میں سب سے پہلی مہر حضرت محمد صلی علیہ وسلم کی تھی، اِس سے پہلے عربوں میں مہر کا قطعی کوئی رواج نہ تھا، آں حضرت کی مہر چاندی کی تھی اُس کا نگینہ حبشہ کی ساخت اور نقش کا خاص "محمد رسول اللّٰہ" کے الفاظ نقش تھے۔ آپ نے یہ مہر سن ہجری کے ساتویں سال ماہ محرم میں اُن خطوط پر ثبت فرمائی جو قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیز مصر اور دیگر رؤسائے عرب کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے، شاہانِ عجم کا یہ دستور تھا کہ وہ کوئی تحریر جب تک مہر شدہ نہ ہو مستند نہیں مانتے تھے، الغرض یہ مہر حضرت کے زمانے میں آپ کے خطوط اور

فرامینِ رسالت پر ثبت ہوتی رہی، آپ کی وفات کے بعد خلافتِ عثمانی تک خلفائے راشدین کے احکامات اس مُہر سے مزین ہوتے رہے لیکن اتفاق سے یہ مُہر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے مدینہ منورہ کے ایک کنوئیں "بیر اریس" نامی میں گر کر گم ہو گئی۔[1]

حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مہروں کے ارغوانی نگینوں پر اُن کے نام کے ساتھ "عبداللہ" کے الفاظ کندہ تھے۔ دیگر اہلِ عرب کی مہروں کی ساخت عموماً بیضوی، چوکور، شش پہل اور ہشت پہل ہوتی تھی گول اُس وقت تک نہ ہوتی جب تک وہ کافی بڑی نہ ہو۔ بڑی اور گول مہر ہونے کی صورت میں وہ انگوٹھی کی بجائے لکڑی کے ایک دستے میں نصب ہوتی اور چھوٹی مُہروں کے درمیان قیمتی جواہرات میں سے ہیرا، نیلم یاقوت، عقیق، مرجان یا فیروزہ وغیرہ جڑا ہوا ہوتا۔ علامہ بلاذری کے قول کے مطابق اُس وقت عرب جیسے تجارتی مرکز میں سارا کاروبار تجارت محض مُہر پر ہوتا تھا۔

مشہور مصنف چارلس وائٹ لکھتا ہے کہ قدیم تُرکی میں ایک بازار "حکاک لار کرتشی" کے نام سے مہر کنوں کے لئے مخصوص تھا۔ جہاں پچاس مشہور اور ماہر مہر کن، مہر کنی اور سکہ سازی میں مصروف رہتے تھے۔ اُن میں زیادہ تر مسلمان تھے جو عربی فارسی اور ترکی رسم الخط سے بخوبی واقف تھے۔ خط کوئی بہت کم لوگ جانتے تھے۔ مہر کنی کا فن حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، اول ضروری تعلیم، تعلیم کے بعد خوش نویسی کی مہارت، پھر سات سال تک مہر کنی کی لگاتار محنت اور کٹھن مشق

[1] بلاغِ مبین از حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی بحوالہ (طبری زرقانی)

تب کہیں جا کر خلیفہ یا اُستاد بنتا اور مہر کُن کہلاتا ۔ اِن لوگوں کے گھروں کی پولیس باقاعدہ تلاشی لیتی، مُبادا وہ جعلی مہریں یا سکّے بنا کر ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ اگر کوئی مہر گُم ہو جاتی تو نئی مہر بناتے وقت ایسا باریک اور نہ معلوم سا فرق رکھا جاتا جس سے اصلی اور نقلی مہر میں فوراً شناخت ہو تی ہے

آئینِ اکبری میں ہم کئی مہر کنوں اور مہروں کا ذکر پاتے ہیں۔

مولانا مقصود ہروی، جنت آشیانی کے ملازمین تھا یہ شخص خطِ رقاع اور نستعلیق کا ماہر تھا۔ اُس نے فولاد کے ایک ٹکڑے پر شہنشاہ اکبر اور اُس کے تمام اجداد کے نام امیر تیمور صاحبقراں تک خطِ رقاع میں کندہ کیے تھے۔

تمکین کابلی۔ خطِ نستعلیق میں ماہر اور مہر کنی میں کامل تھا۔

میر دوست کابلی خطِ نستعلیق اور خطِ رقاع کا اُستاد تھا اور عقیق پر مہریں کندہ کرتا تھا اس کا نستعلیق رقاع سے بہتر تھا۔

مولانا ابراہیم۔ یہ شخص عقیق نگاری میں اپنے بھائی شرف یزدی کا شاگرد تھا اور خطِ رقاع اور نستعلیق میں مشہورِ روزگار، لعلہائے شاہی پر لعل جلال کا نقش اِسی شخص نے کندہ کیا تھا۔

مولانا علی احمد دہلوی۔ اِس کا نستعلیق عدیم المثال تھا اور خطوط میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ فولاد پر نقاشی کرنے میں یگانۂ روزگار مانا جاتا تھا۔ اپنے باپ شیخ حسین کا شاگرد تھا اور نقوش کے معاملہ میں مولانا مقصود ہروی کا مقلد۔ یہ علی احمد شاعر بھی تھے، نشانی تخلص کرتے تھے، جہانگیر بادشاہ کے اُستاد تھے۔ استاد بھی ایسے کہ اگر کسی علمی یا ادبی مسئلہ پر کچھ دریافت کرنا ہوتا تو انہی سے پوچھتے، عراق، ترکستان اور خراسان تک سے لوگ آتے اور اِن سے مہریں کندہ کرا کے لے جاتے۔ خوشا نصیب کہ اِن کے ہنر

اور کاریگری کی بدولت آج تک ہندوستان اور دِلّی کا نام روشن ہے۔ اسی طرح پانچ مہریں تھیں :-

مہرِ محرابی۔ اِس پر بادشاہ نام اور نام کے چاروں طرف یہ شعر منقش تھا ؎

راستی موجب رضائے خدا است ٭ کس ندیدم کہ گُم شد از رہِ راست

یہ مہر اجرائے احکام اور دادخواہی کے فرامین تبت ہوتی تھی۔

مہرِ مدوّر یا اُزوگ۔ اُزوگ چغتائی لفظ ہے، یہ مہر دیگر فرامین پر لگتی تھی۔

مُہرکلاں۔ اِس پر بادشاہ کا نام اور نام کے اعداد دونوں نقش تھے اور یہ اُن خطوط پر لگائی جاتی تھی جو بادشاہ کی طرف سے دوسرے بادشاہوں کے نام بھیجے جاتے تھے۔

مہرِ چہار گوشہ۔ اِس پر اللہ اکبر جل جلالہٗ کا نقش تھا۔ یہ مختلف قسم کے احکام پر ثبت ہوتی تھی۔

مہرِ شاہی حرم سرا۔ یہ شاہی حرم سرا کے احکام پر لگائی جاتی تھی غرض یہی خطاطی اور مہر کنی جن کا آپس میں چولی دامن کا ساساتھ ہے۔ قدیم سے ہر زمانے اور ہر بادشاہت میں برابر ابھرتی، رنگ جماتی، نئی زندگی پاتی اور اپنے بے شمار خطوط اور نقوش میں تاریخ کہن دہراتی اور مغل عہدِ حکومت کی داستان سناتی۔ ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے عہد میں بہادر شاہ بادشاہ کے ساتھ دہلی کے لال قلعہ اور شاہجہان آباد کی چہار دیواری میں زندگی کا آخری سانس لیتی ہے۔ لیکن آخر دم تک

؎ آئینِ اکبری جلد اول صفحہ ۷۸ مطبوعہ دارالطبع عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۷ھ

بھی اِسی لال حویلی اور اِسی دِلّی میں وہ وہ اہلِ ہنر اور صاحبِ کمال موجود تھے۔ جن کو دیکھ کر عہدِ اکبری اور شاہجہانی کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اور جو دیکھتا تھا عش عش کرتا تھا۔

خطّاطوں میں خود ابوظفر، اُن کے علاوہ میاں محمد جان، میر امام علی سید جلال الدین، اور بدرالدین علی خاں شاہی خوش نویسوں میں تھے بدرالدین علی خاں کو بادشاہ کی طرف سے مرصع رقم کا خطاب تھا، خطِ تعلیق اور نسخ کے اُستاد تھے، ہندی اور انگریزی حروف میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ یہ اپنے نانا شیخ محمدؐ یار کے شاگرد تھے لیکن خط میں آغا عبدالرشید کی طرز کے مقلّد۔ دہلی میں اِن سے بڑھ کر کوئی حکاک یعنی مہر کن نہ تھا ایک ایک مہر کی قیمت ایک ایک اور دو دو ہزار روپے تک ملتی تھی۔ دہلی کے مشہور و معروف شاعر حضرت غالبؔ کی دونوں مہریں اسی یگانۂ روزگار نے بنائی تھیں، اُنھیں کے ہاتھ کی تین مہریں راقم الحروف کے خاندان میں بھی اب تک موجود ہیں، ایک لوہے پر ہے اور دو عقیق پر، عقیق والی مہروں پر میرے جدِّ امجد حضرت سید محمدؐ صاحب مرحوم امام جامع مسجد دہلی کا نام کندہ ہے۔ " دریبے " میں جس کا اصل نام " دُرِّ بے بہا " تھا ایک کوچہ بُلاقی بیگم کے نام سے اب تک مشہور ہے، اُسی کے آس پاس کہیں رہا کرتے تھے، بدرالدین علی خاں کی بنوائی ہوئی مسجد اب تک وہاں موجود ہے جس کی پیشانی پر سنگِ باسی کا ایک پتھر تھا اور اُس پر یہ عبارت کندہ تھی۔

کتبہ

براۓ حضرت سبحان و رحمان ❊ شد این مسجد بنا صد شکر و احسان

تمامی ملکِ خود زرعی و سکنی ٭ نمودم وقف آں را از دل و جاں
ازاں نصفے برائے وارثان است ٭ دگر بہرِ مساکینِ مستحقاں
بریں تقسیم اگر حجت کند کس ٭ زحاکم منع کردندش مسلماں
الٰہی تا بہ حشر ایں را نگہدار ٭ زبیع و رہن و غصب و جملہ نقصاں
بگو سالِ از سرِ للہ نفشی ٭ مساکیں جائے بدرالدین علیخاں

لیکن اب نہ وہ پتھر ہے اور نہ وہ عبارت، اُس کی جگہ مسجد کی مغربی دیوار کی پشت پر جو سڑک پر سے نظر آتی ہے۔ ایک سُنہری نقشہ سورج کا بنا ہوا ہے، اُسی کے ایک گوشہ میں یہ عبارت درج ہے۔

کتبہ دیگر

چوں آفتاب روشن توحید ذوالجلال ٭ بنمود رُخ ز مطلع ایں غرہ کمال
اے عابدانِ دہر چو ایں سجدگاہ نور ٭ بینید در رکوع درآئید چوں ہلال
بندہ مسکین بدرالدین علیخان از نیاز ٭ کرد ایں تعمیر بہرِ خالقِ رب العلا
از سرِ برکاتِ ہاتف سالِ تاریخش بگفت ٭ مہبط فیضِ الٰہی مسجدی نیکو بنا (۱۲۲۹ھ)

بدرالدین علی خاں کے دو لڑکے تھے، رشید الدین علی خاں اور سعادت اللہ خاں، آخر الذکر لاولد گذر گئے۔ مرحوم نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد میں ایک مدرسہ عربیہ بھی قائم کیا تھا جو اَب نہیں رہا۔ رشید الدین علی خاں کے لڑکے ظہیر الدین خاں مہرکن ہوتے، لال دروازہ میں رہا کرتے تھے کہتے ہیں کہ اُن کے پاس اپنے دادا کی بنائی ہوئی مہروں کے نقوش کا ایک البم بھی تھا، راقم الحروف کے دیکھنے میں نہیں آیا۔

بدرالدین علی خاں کے شاگردوں میں مُنور علی خاں مہرکن ساکن

کٹرہ بڑیاں کا نام لیا جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ عبداللہ ابن حسین بخش مہرکن کے شاگرد تھے جو بدرالدین علی خاں سے پہلے عقیق پر مہریں کندہ کرتے تھے، حسین بخش کے خاندان میں ابھی تک مہرکنی باقی ہے چنانچہ حسین بخش مہرکن کے بعد اُن کے لڑکے عبداللہ اور عبداللہ کے لڑکے کریم الدین مہرکن ہوتے۔ اور اب کریم الدین کے لڑکے علیم الدین اور اُن کے پوتے ضیاءالدین مہرکن ساکن مٹیا محل دہلی زندہ ہیں اور اپنا آبائی پیشہ، مہرکنی کر کے دِلی کے چاندنی چوک میں اپنی ساکھ جمائے بیٹھے ہیں۔ خطِ کوفی - خطِ ثلث - خطِ عربی - خطِ نستعلیق خطِ طغریٰ رومی وسلطانی - خطِ گلزار - خطِ ماہی، ناگری، گرمکھی - بنگلہ انگریزی خواہ کسی خط میں لکھوالو ---- اور چاندی - سونے - لوہے پتھر میں سے جس چیز پر چاہو مہر بنوالو -

عبداللہ مرحوم کے شاگردوں میں احمد جان اور اُن کے بھائی نثار احمد بھی تھے، نثار احمد مرحوم کے شاگردوں میں ان کے لڑکے محمد احمد مہرکن حیات ہیں، لال کنوئیں رہتے ہیں۔ منور علی خاں کے شاگردوں میں فیض علی، خلیفہ عبدالعزیز اور اسرار الحق وغیرہ ہوئے۔ اسرار الحق کے لڑکے ضمیر الحق ساکن پہاڑ گنج کی دوکان اِس وقت دریبہ کلاں میں ہے، مہرکنی کرتے ہیں -

اُن کے علاوہ موجودہ حضرات میں اسلام الدین مرحوم کے لڑکے صلاح الدین اور بدیع الدین ساکن کوچہ نٹواں کا شمار بھی خاندانی مہرکنوں میں ہوتا ہے۔ لوہے اور پیتل وغیرہ پر لاجواب مہریں بناتے ہیں، گورنمنٹ انگریزی کا اکثر کام انہی کے ہاں بنتا ہے۔ اِن کا کارخانہ

سرائے توپ خانے میں ہے، مرزا احمد بیگ ربڑ کی ہر قسم کی مہریں بناتے ہیں۔ اُن کی دوکان چاندنی چوک میں ہے۔

مہر کنی بظاہر بہت مختصر اور آسان کام ہے، لیکن درحقیقت اپنی نزاکت خوبصورتی اور باریکی کے اعتبار سے نہایت کاریگری اور دیدہ ریزی کا کام ہے، چاندی سونے لوہے اور تانبے کی سادہ مہروں کی بہ نسبت نگینہ کی مہریں بڑی مشکل سے بنتی ہیں۔ اول نگینہ گر آپ کے اُس نگینہ کو کہ جس پر آپ کو اپنی مہر کھدوانی مقصود ہے۔ گول بیضوی یا چوکور جو ساخت بھی آپ پسند کریں گے اُسی ساخت کا بنا کر دے گا۔ اس کے بعد مہر کنی شروع ہوتی ہے، مہر کن اِس نگینہ کی صاف سطح پر عمدہ قسم کی سیاہ روشنائی پھیر کر ہلکی سی ایک تہ قائم کرتا ہے پھر مہر کی ایک باریک نوکدار پنسل سے صاحب مہر کا نام اور جو نقش و نگار کندہ کرنے ہوتے ہیں۔ اُن کے نشان ڈالتا ہے۔ جسے مہر کنی کی اِصطلاح میں الفاظ کی نشست بٹھانا یا کرسی کرنا کہتے ہیں۔ پھر نگ پر اِن نقوش کو ہیرے کی کنی والی قلم سے ذرا گہرا اور پکا کیا جاتا ہے، اِس کے بعد مہر کے اُس نگینہ کو کندہ کرنے کی غرض سے زیر چوب (لکڑی کی دستی) پر ایک مسالہ سے جما لیا جاتا ہے۔ اب بائیں ہاتھ سے اِس زیر چوب کو پکڑ کر حسب ضرورت گھماتے جاتے ہیں۔ اور دائیں ہاتھ سے کمانی پکڑ کر مہر کھودنے کے چرخ کو حرکت دی جاتی ہے جس کی کھونٹیوں کے درمیان فولاد کی وہ چانپی (برما) لگی ہوتی ہے جو مہر کے حروف کا دور کاٹتی ہے۔ اصل میں یہ چانپی نہیں بلکہ وہ تیز دھار فولادی پھرکی جو اس چانپی یا برمے کے منہ پر پیوست ہوتی ہے۔

اِس برمے کا سیدھا ہونا انتہائی ضروری اور لازمی ہے۔

چاندی سونے تانبے پیتل اور لوہے کی مہروں۔ تمغوں، مونوگراموں اور چپڑاسوں میں صرف اس قدر کام کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی سطح پر گیرو یا کھریا پھیر کر اُن حروف کی نشست قائم کی جاتی ہے پھر اسپات کی نوکدار قلم سے اُن نشانوں کو گہرا کرتے ہیں، آخر میں لوہے کے شکنجے میں کَس کر فولادی برمے کے ذریعہ احتیاط کے ساتھ اُن نقوش کو حسب دلخواہ کندہ کر لیتے ہیں۔ چپڑاسوں وغیرہ کے حروف کو سیاہ اور روشن کرنے کے لئے چپڑا لاکھ شوسٹی کے تیل یا تارکول میں ملا کر اِن حروف پر پھیر دیا جاتا ہے۔

دلّی کے پُرانے خاندانوں میں جو لوگ اپنے بزرگوں کی پُرانی تہذیب کے دلدادہ اور پُرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ اب بھی یہ چاندی سونے کی سادہ اور نگینہ والی مہریں بنواتے ہیں۔ ورنہ فی الاصل اس نئے اور ترقی یافتہ دور میں اِن مہروں کی جگہ ربڑ کی مہریں نکل آئی ہیں جو ظاہر ہے کہ چاندی سونے اور نگینہ کی مہروں کی بہ نسبت بہت کم داموں میں بہت جلد تیار ہو جاتی ہیں۔ آج آرڈر دیجئے کل آ کر لے لیجئے، فوری ضرورت ہو تو دو چار گھنٹے ہی میں مل جائیں گی۔ خواہ وہ انگریزی حروف میں ہوں یا مختلف ہندوستانی حروف میں، سرکاری اور ریاستی تمام محکموں میں آج کل اِسی کا رواج ہے۔

ربڑ کی مہریں ایک روپے سے دس بارہ روپے تک اور نگینہ کی مہریں اِس زمانے میں دس بارہ سے لے کر سو دو سو روپے تک میں بنتی ہیں۔

دلّی کے سادے کار عام طور پر لاہوریوں کے نام سے مشہور ہیں۔ مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی مولف فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران کی تحقیق کے متعلق اُن کا یہ عرف کوٹلی لوہارن کے باشندے ہونے کی وجہ سے پڑ گیا ہے۔ جہاں کی اعلیٰ ظروف سازی کی صنعت کسی زمانے میں بڑی مشہور تھی۔ دلّی میں اِن لوگوں کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے، کوچہ اُستاد حامد۔ چاہ رہٹ۔ کوچہ نٹواں۔ کوچہ رائے مان اور پہاڑ گنج یہ چاروں پانچوں مقامات اُن کی آبادی کے بڑے مرکز ہیں۔ دِلّی کے علاوہ اِن کی برادری کے لوگ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں بالخصوص آگرہ، لکھنؤ، مراد آباد، لاہور، بمبئی کلکتہ، کراچی اور مختلف چھوٹی بڑی ریاستوں مثلاً حیدر آباد دکن، بھوپال، رامپور۔ ٹونک۔ لوہارو۔ الور۔ جے پور۔ گوالیار۔ پٹیالہ اور میسور وغیرہ میں پھیلے ہوتے ہیں۔

دلی کے سادے کاروں کے متعلق اِن کے لاہوری مشہور ہونے کی جو وجہ ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی نے بتائی ہے، اُس سے دلّی کے سادے کاروں کو اتفاق نہیں۔ بجز اس بات کے کہ مغلوں کے عہد میں سادہ کاروں کی برادری کے لوگ دہلی میں آکر آباد ہوئے لطف یہ ہے کہ خود اِن غریبوں کو اپنی بُود و باش، اپنے خاندان اور اپنے پیشے کی تاریخ کا پوری طرح علم نہیں۔ وہ شبہ کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم مشہور اُستادِ زماں "حامد اور احمد" لاہوری و شاہجہانی کی اولاد سے ہیں اور بعہدِ شاہجہاں لاہور سے دہلی آئے۔

"احمد و حامد" کون تھے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں جناب

محمد عبداللہ صاحب چغتائی کے مضمون "معمارِ تاج" مطبوعہ سالنامہ کارواں لاہور (۱۹۳۴ء) سے بڑی مدد ملتی ہے جس میں علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کے اُس مقالے کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں جو انھوں نے دائرہ معارفِ اسلامیہ لاہور کے جلسہ میں بعنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان" پڑھا تھا۔ اِس مضمون میں شروع سے آخر تک احمد وحامد اور احمد کے لڑکے عطاء اللہ رشیدی۔ لطف اللہ مہندس اور نور اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ نیز لطف اللہ مہندس کے دونوں لڑکوں — امام الدین الریاضی لاہوری، اور خیر اللہ — اور امام الدین الریاضی کے لڑکے محمد علی ریاضی کا نام بھی معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۴۸ ہجری میں شاہجہاں نے دہلی کی عمارات کی داغ بیل ڈالی تھی، اُس زمانے کی تواریخ "عمل صالح" اور "بادشاہ نامہ" محمد وارث میں احمد وحامد دو معماروں کے نام مذکور ہیں۔ جن کی نگرانی میں دہلی کی عمارات تعمیر ہوئیں جن کا ثبوت ذیل کی عبارات سے ملتا ہے:۔

عمل صالح — بعد از پنج ساعت از شب جمعہ بیست پنجم ذی الحجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس موافق (۱۰۴۸) ہجری در زمان محمود واداں مسعود اُستاد احمد وحامد سرآمد معماراں، نادرہ کار، بسرکاری عزت خاں صوبہ دار آنجا وصاحب اہتمام ایں کار مطابق طرحی تازہ

ماخوذ از "معمار تاج" بحوالہ نسخہ برٹش میوزیم ADD 2.623

دِلّی کی سادہ کاری

سادہ کاری کو صرف سادہ کاری کہنا میرے نزدیک اُس صنعت کو کوسنا ہے، ہاں سادہ کاری کو حُسن کاری اور سادہ کار حُسن کار کہئے تو بجا و درست، اِس لئے کہ سادگی و پُرکاری اُس کی صنعت کا اَدنیٰ شعبدہ ہے۔

سادہ کار غالباً "سُدھ کار" کا غلط تلفّظ ہے، سُدھ کار یعنی جس کا کام خوبصورتی اور نزاکت کے اعتبار سے بہت اچھا اور پورے باون تولے اور پاؤ رتّی کا ہو لیکن شدھ کار کی بجائے "صدکار" کہیں تو مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ سادہ کاری کا کام اپنے گوناگوں خُوبیوں، کام کے پھیلاؤ اور وسعت کے اعتبار سے بہت سے پیشوں پر مشتمل ہے۔ ایک پٹوہ گری کو چھوڑ کر باقی نیاری - سُناری چِتائی کاری - مرصع کاری، نگینہ گری، بندھائی، جڑائی، مینا کاری یہاں تک کہ لوہار اور بڑھئی تک کے بعض کام اِس میں آجاتے ہیں لہٰذا صحیح معنوں میں سادہ کار وہی ہے جو اِن سب پیشوں سے واقفیت رکھتا ہو اور سارا کام شروع سے آخر تک خود کرے۔

وَنقشے بدیع کہ ہیچو بے نظیرِ آں در شش جہتِ دُنیا
بنظرِ نظارگیاں در نیامدہ بود۔ الخ

بادشاہ نا محمدؐ وارث۔ بحکمِ اشرف بعد از پنج ساعت از شبِ جمعہ بست و پنجم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت بسال دوازدھم از جلوسِ اقدس موافق سنہ ہزار و چہل و ہشت ہجری کہ مختارِ دانشورانِ انجم و افلاک بود استاد احمد و حامد کہ معماران ماہر بودند کارِ عمارت بسر آمد بسرکاری عزت خاں برادر زادہ عبداللہ خاں بہادر فیروز جنگ کہ ناظمِ صوبہ دہلی و اہتمام تاسیسِ عمارات مذکورہ باو مفوض فرمودہ مطابق طرحی کہ در پیش گاہِ خلافت مقرر گشتہ بود رنگ ریختند۔ الخ۔

مضمون مذکورہ بالا میں ایک جگہ سیّد مرتضیٰ صاحب ہیڈ کلرک کمانڈر انچیف دہلی کا بھی ذکر آیا ہے کہ اُن کا یہ خیال ہے کہ احمد و حامد دونوں بھائی تھے، لیکن یہاں ہمارا موضوع بحث یہ نہیں بلکہ قابلِ تحقیق یہ بات تھی کہ کوچہ استاد حامد میں سادے کاروں کا جو کنبہ اِس وقت آباد ہے اُن کا سلسلۂ نسب حامد و احمد سے ملتا ہے یا نہیں، غالباً نہیں ملتا اور بعض سادے کاروں کے بقول اگر ملتا

مأخوذ از "معمارِ تاج" بحوالہ نسخہ برٹش میوزیم CAPS - ORD3

ہے تو پھر یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ دِلّی کے سادے کار لاہوری ہیں اور بعہدِ شاہجہاں عزت خاں ناظم و مہتمم بانیٔ عماراتِ شاہجہانی صوبہ دہلی کے بلانے پر دہلی آئے، اُن میں سے بعض معمار ہوئے، بعض نے مصوری کو پسند کیا، بعض نے نقاشی منتخب کی اور بعض نے اِس پیشہ سادہ کاری کو اختیار کیا' اور ہر ایک نے اپنے ہنر و فن کو نہایت حُسن و خوبی اور کمال کاریگری و صناعی کے ساتھ پیش کیا، شاہی قدردانی اور سرپرستی نے چمکایا، ہندوستان کی ہر سمت اور ہر گوشے میں پھیلے اور مشہور ہوئے، چنانچہ غدر کے بعد جو لوگ مقبولِ عوام ہوئے اور شہرتِ دوام حاصل کی وہ اِسی مشہور و معروف تاریخی کوچہ اُستاد حامد کے رہنے اور بسنے والے تھے. وہ چند بزرگ یہ تھے

عبدالستار، فیض محمد ولد الٰہی بخش، چودھری نیاز الدین، محمد یوسف، عبداللہ

اور آج بھی اِن کے فن اور ہنر کو یاد دلانے اور زندہ رکھنے والے اُن کے جانشین دہلی میں موجود ہیں، بعض ایسے ہیں جو مکمل سادہ کار ہیں اور بعض ایسے ہیں جو سادے کاری کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ پر اس طرح حاوی ہیں کہ کوئی دوسرا اُن کی نظیر نہیں

چنانچہ کوچہ اُستاد حامد میں، محمد سلیمان خلف محمد اکبر مرحوم (۲) عبدالغفار

محلہ چاہ رہٹ میں، فتح محمد خلف الٰہی بخش مرحوم -

کوچہ نٹوان میں ، چودھری سعید الدین خلف بدر الدین مرحوم

(۲) ریاض الدین خلف وزیر الدین مرحوم

(۳) محمد فضل (۴) محمد عثمان ملازم جے پور

پہاڑ گنج میں ، عنایت الرحمٰن خلف عزیز الرحمٰن مرحوم کا

شمار مشہور و معروف سادہ کاروں میں ہوتا ہے۔

دِلی کے اِنہی سادہ کاروں کا ایک خاندان آج سے ایک سو برس پہلے ریاست الور میں جا کر آباد ہوا۔ چنانچہ آج بھی الور کے اسلحہ خانہ میں جس قدر پُرانی تلواریں اور دیگر اسلحہ جات نادر و قیمتی ہیں وہ سب اِسی خاندان کی دستکاری کا نمونہ ہیں۔ جن کو مختلف ولایتوں کی نمائشوں میں بھیجا جا چکا ہے۔ اِن خدماتِ قدیم کی بدولت آج بھی شیخ بشیر احمد صاحب ابنِ شیخ نثار احمد ابنِ شیخ محمدؐ ابراہیم ریاست الور کے منصب دار یعنی عزیز السلطنت آنریری مجسٹریٹ، معافی دار اور میونسپل کمشنر ہیں، لطیف احمد صاحب اِن کے برادر خورد ہیں۔

سادہ کاری کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اِس کی متعلقہ صنعتوں کو تھوڑا بہت ضرور سمجھا جائے۔ اِس لئے کہ یہی زیور سازی کا طریقۂ عمل ہے۔

پیشہ نیاری — نیارئے کا کام یہ ہے کہ کان سے نکالے ہوئے یا کھوٹے سونے چاندی کو میل اور کھوٹ وغیرہ سے کیمیاوی طریق پر صاف اور ایک دھات سے دوسری دھات کو جدا کرے۔

پیشہ سُناری — یعنی زرگری، زیور وغیرہ کو چند مسالوں سے دھو کر صاف کرنا، چمکانا یا ملمع کرنا۔ تہواروں پر عورتیں اکثر اپنے زیورات اُجلوایا کرتی ہیں۔ جڑاؤ زیور کا اُجالنا بہت مشکل کام ہے۔

پیشہ چیائی کاری۔ یعنی نقشین کام، زیور یا برتن کی سطح پر لوہے کے قلم کی نوک سے گود کر مختلف خوبصورت خطوط اور پھول پتے بنانا۔

پیشہ مرصع کاری۔ یہ اصل میں نگینہ گری ہے، جواہرات کو سان پر گھس کر اُن کے ڈول بنائے جاتے ہیں اور چھل اور گھاٹ تراشنے کے بعد اُن پر جلا اور چمک پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے سان کا چکلا یا چاک، لاکھ اور چینی مٹی کے مرکب سے بنایا جاتا ہے۔

پیشہ بندھائی۔ موتی اور دیگر جواہرات میں سوراخ کرنا، اس کام کے کاریگر کو بندھیرا کہتے ہیں، بندھائی کام سدھائی سے زیادہ مشکل ہے اگر موتی بیندھنے میں ٹوٹ جائے تو پھر وہ زیور کے مصرف کا نہیں رہتا چنانچہ مثل مشہور ہے کہ بندھ گیا تو موتی نہیں تو کنکر۔

پیشہ جڑائی۔ انگریزی میں اس کو سٹنگ کہتے ہیں۔ زیورات میں نگینے جڑنے کا کام اس کے کاریگر کو جڑیا یا سادے کار کہتے ہیں۔

پیشہ میناکاری یہ ایک قسم کی پچی کاری کا کام ہے جو سونے چاندی کے سادہ اور نقشین دونوں قسم کے زیورات پر ہوتا ہے، زیورات کی سطح پر اوّل پھول پتیاں کندہ کی جاتی ہیں۔ پھر اُن کندہ نقوش میں کچ لون یعنی کانچ سے بنے ہوئے رنگین مسالے یا ایک مرکب سیاہ دھات بھر دیتے ہیں اس عمل سے وہ گل بوٹے سطح پر رنگ برنگ کے نظر آنے لگتے ہیں۔

پیشہ لوہار نہائی۔ ہتوڑے، چھوٹی بڑی نازک ہتوڑیاں، سون

ٹھپے، پانسہ گھوڑی، بنک نال اور دیگر مختلف اوزار لوہے اور پیتل کے بنائے جاتے ہیں۔

پیشہ بڑھئی۔ مختلف اوزاروں کے دستے، کمانیاں، سونے چاندی کے تار کھینچنے کی گھوڑی، مخمل منڈھے ہوئے کارڈ بورڈ یا لکڑی کے بکس جس میں زیورات کو سجا کر رکھا جاتا ہے۔ اِن کاموں کے جاننے کے علاوہ سادہ کار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نقاش ہو یعنی ڈرائنگ کے کام سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا ہو تاکہ زیورات کے لئے طرح بہ طرح کے بیل بوٹے بنا کر نئے سے نئے ڈیزائن ایجاد کر سکے۔ سونے اور چاندی کی مختلف قسمیں ہیں:-

بارابانی سونا سب سے اعلیٰ اور عمدہ قسم کا سونا، اس میں بالکل کھوٹ نہیں ہوتی۔ اِسے انگریزی میں چوبیس کیرٹ گولڈ CART GOLD کہتے ہیں، کیرٹ اصل میں ایک انگریزی وزن ہے جس کی تول سونے میں چار رتی اور جواہرات میں چار گرین (ایک رتی) کے برابر ہے۔

پاسے کا سونا۔ کان سے تازہ آئے ہوئے سونے کی تقریباً بیس تولہ وزنی مستطیل ٹکڑی ہوتی ہے۔

پاٹلا اور روا۔ استعمال کیا ہوا سونا ہوتا ہے جس کو تیزاب میں پکا کر نکھارا اور صاف کیا گیا ہو۔

جرمنی سونا۔ اِس میں سونا بالکل نہیں ہوتا پانچ حصے تانبہ اور ایک حصے جست ہوتی ہے۔

امریکن سونا۔ اِس سونے میں صرف ایک ماشہ سونا ہوتا ہے باقی نو ماشہ تانبہ اور دو ماشہ چاندی، کبھی سیاہ نہیں پڑتا۔

بِسست بسوہ اعلیٰ قسم کی بے کھوٹ چاندی ڈلوں کی صورت میں۔

پتھرے کی چاندی پُرانا زری گوٹا اور ایسی قسم کا دوسرا سامانِ زیور گلا کر اور کھوٹ سے صاف کر کے اوّل روپے کی صورت میں اور زیادہ صاف کیا تو ڈلوں میں اور اگر درجہ اوّل کی چاندی بنانی مقصود ہوئی تو پتھروں کی شکل میں بنا لیتے ہیں

یہ ساری تجارت بڑے بڑے صرافوں اور جوہریوں کے ہاتھوں میں ہے جو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں بڑی بڑی دوکانیں لئے بیٹھے ہیں۔ اِن دوکانوں میں یا تو سفید براق چاندنی کا فرش ہوگا اور مالک دوکان جس کے دائیں یا بائیں طرف ایک چھوٹی سی آہنی الماری اور سامنے ایک خوبصورت صندوقچہ رکھا ہوتا ہے، ایک مخملی گدّے پر براجمان اپنی دوکانداری میں مصروف نظر آتا ہے، یا جا بجا ایرانی قالین بچھے ہوتے ہیں اور ساری دوکان مغربی طرز پر بیش قیمت کرسیوں، صوفوں اور مختلف شیشہ و آلات سے آراستہ اور بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوتی ہے۔ شیشہ کے خوشنما گلاس کیسوں اور الماریوں میں مخملی کیسوں کے اندر یہ زیورات اِس طرح سجے ہوتے نظر آتے ہیں کہ ایک دفعہ تو بڑے سے بڑے خریدار کی آنکھیں بھی جب بجلی کی روشنی میں اِن چمکتے دمکتے ہوئے جواہرات اور جڑاؤ زیوروں کو دیکھتی ہیں تو بے اختیار خیرہ ہو جاتی ہیں۔

یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن وہ غریب سادہ کار جس کی صنعت کو اس شان و اہتمام کے ساتھ دوکانوں میں رکھا جاتا ہے اور فروخت کر کے سینکڑوں اور ہزاروں روپے کماتے جاتے ہیں۔ شاذ و نادر بھی اپنے قدردان اور صاحب ذوق خریدار کی شکل تک نہیں دیکھ سکتا اُس کا کام صرف یہی ہے کہ اُس کا متمول دوکاندار اپنے شہر کی بنک یا بازار سے سونا چاندی خرید کر اُس کو دیتا ہے اور وہ دن رات اپنا خون پسینہ ایک کر کے اپنی صنعت کے نمونے اُس کو پیش کرتا رہے، اُسے اپنی محنت اور کاریگری کی اُجرت صرف چار پانچ روپے یومیہ کے حساب سے روزانہ یا ہفتہ وار یا ماہ بماہ ملتی رہے یا چند مخصوص بڑھیا چیزیں بنانے کی کچھ رقم مقرر کر کے ٹھیکہ پر کام کرتا رہے، ٹھیکہ کی صورت میں اُس کو قدرے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، اِس لئے کہ جس قدر بڑھیا زیور ہوگا۔ اُسی قدر اُس کی اُجرت بھی زیادہ ہوگی۔

عام طور پر ٹھوس سونے کا زیور ہو یا جس میں لاکھ بھری جاتے اُس کی اُجرت آجکل پانچ روپے فی تولہ مقرر ہے۔ لیکن جڑاؤ زیورات کی شرح کا کوئی معیار نہیں، ایک جڑاؤ جھومر، نکلس یا ہار کی اُجرت کم از کم ستر روپے سے شروع ہو کر ہزار ڈیڑھ ہزار تک پہنچتی ہے۔ لیکن ایسے اعلیٰ قسم کے کاریگر شہر کے جوہریوں یا صرافوں کی دوکانوں کے تاوے کاٹتے نظر نہیں آتے بلکہ نوابوں اور راجاؤں کے منظورِ نظر ہوتے ہیں۔ اور اُن کی ڈیوڑھیوں میں کام کر کے اپنی محنت کا صلہ اور فن کا انعام پاتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی صنعت کے نمونے ریاستوں سے گذر کر سمندر پار ولایتوں میں طلب کئے جاتے ہیں۔ بادشاہوں اور شہزادیوں کے

دست و بازو کی زینت اور زیبِ گوش و گلو ہوتے ہیں اور اُس وقت صحیح معنوں میں اُن کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔

شاہی دربار میں پہنچ کر اُن کی صنعت صرف شاہی زیورات ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ سونے چاندی کے سادے اور جڑاؤ جام، صراحیاں جگ۔ سلفچی۔ آفتابے، عطردان۔ خاصدان۔ پیالے۔ طشتریاں۔ چاقو۔ پیش قبض، خنجر۔ تلوار۔ زرہ بکتر۔ ہودے۔ جنگی رتھ، تاج اور تخت یہاں تک کہ محلوں کے در و دیوار بھی اُن کی مرصع کاری سے مُنقش اور مُزیّن نظر آتے ہیں،

یہ بادشاہوں اور راجہ نوابوں کے شوق اور سادے کاروں کی کاریگری ہی کا نتیجہ تھا کہ آج ہم سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک طرح بہ طرح کے بیسیوں زیورات پاتے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو بادشاہوں اور اُن کی بیگمات کی ایجاد ہیں، بہت سے ایسے ہیں جو ملکہ و بادشاہ، راجہ و رانی کی دیکھا دیکھی عوام میں امیر و غریب اور شہری و دیہاتی نے اپنی اپنی عقل اور ذوق کے مطابق بنائے اور اس قدر مقبول ہوئے کہ اُن کے بغیر عورت کا حُسن پھیکا، شادی بیاہ بند۔

جب تک عورت کے بالوں میں ہوتی، سیس پھول۔ مانگ میں مانگ۔ ماتھے پر ٹیکا، جھومر۔ کانوں کے سہارے، آویزے، بندے، بجلی بالے، ھُلنیاں، جھمکے، پتے، پالیاں۔ ناک میں نتھنی، لونگ، کیل بُلاق۔ گلے میں دُگدگی، ٹیپ جگنی، چمپاکلی، مالا، گلوبند، توڑا چندن ہار، کیری۔ بازوؤں پر بازو بند، اِکّے، نورتن، نونگے

جوشن۔ ہاتھوں میں جہانگیریاں، نوگریاں، پہونچیاں، چوہے دنتیاں، کنگن، اِک نگیاں۔ ہاتھ پہ ہتھ پھول۔ انگوٹھے پر آرسی۔ انگلیوں میں چھلّے، انگوٹھی، کمر پر کمرزیب، ازاربند کی زنجیر، کنجیوں کا چھلّا۔ پیروں کی پائل، پازیب، جھانجن، توڑے، لچھے، چوڑیاں، انگلیوں کے چٹکی چھلے نہ ہوں تو سمجھ لیجئے کہ اُس کے سولہ سنگار ختم۔

سونا اصل میں عورت کی جان ہے اور سچ پوچھو تو اِس سونے نے عورت کو کچھ ایسی خوبصورتی اور شوبھا بخشی کہ شاعر زُلف و کاکل، رُخ و رخسار، لب و دنداں اور زنخداں کی تعریف کے ساتھ ساتھ زیورات کی قصیدہ خوانی بھی کرنے لگے۔ حضرت خسروؔ علیہ رحمۃ زیور کی پہیلی بوجھتے ہیں ؎

فارسی بولی آئینہ ترکی ڈھونڈی پائینہ
ہندی بولوں آرسی آئے خسروؔ کہے کوئی نہ بتائے

جنابِ غالبؔ دہلوی فرماتے ہیں ؎

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

میر حسنؔ دہلوی کہتے ہیں ؎

لگا ڈگڈگی بیچ لڑا است لڑا سراسر گلے حسنؔ اُن کے پڑا
وہ پہونچی زمرد کی اور دست بند نزاکت میں تھی شاخِ گل سے دوچند

غرض اِسی طرح دِلّی کی اِس قدیم دستکاری کے قصیدے اُستاذہ کے کلام میں جابجا منتشر ہیں۔ دیگر قدیم دستکاریوں کے برعکس جو امتدادِ زمانہ سے مٹتی گئیں اور بالآخر فنا ہو گئیں سادے کاری روز افزوں ترقی پر رہی ہے اور اس میں نت نئے فنی پہلو اور فن کارانہ خوبیوں کا اضافہ ہو رہا ہے، سادے کاروں کی مالی حالت بھی پہلے سے بدرجہا بہتر ہے اور شہر کے متمول طبقے میں اُن کا شمار ہوتا ہے ؛

جنتا کے سنگیت

ہماری شاعری کا دستور یہ ہے کہ نظم - غزل - قصیدہ - مثنوی اور رباعی وغیرہ کے ذریعے شعرا اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں، تمام اشعار علمِ عروض کے مطابق ایک خاص بحر، ردیف اور قافیہ کے ماتحت کہے جاتے ہیں لیکن اِس کے برعکس ایک ایسی شاعری بھی ہے جو اِن قیود سے تقریباً آزاد ہے۔

اِس میں شروع سے آخر تک تُک بندی کے سوا کوئی فنی شاعری نہیں ہوتی، چند موزوں و مقفّیٰ فقرے یا مصرعے آسان سے آسان الفاظ اور سہل سے سہل مثالوں کی صورت میں ڈھل کر بے اختیار ادا ہو جاتے ہیں۔ اِس شاعری کے مُوجد اور کرتا دھرتا ہندوستان کے عام کام کاج کرنے والے وہ نَر ناری ہیں جو دھوبی، تیلی، ماہی گیر کسان، مزدور، چمار اور بھنگی کہلاتے ہیں۔ جن کے جیون کی شروع سے یہ رِیت رہی ہے کہ خود اندھیرے میں رہ کر ہماری زندگی میں اُجالا کرتے ہیں اور رات دن کھبو کوں مر کر ہم کو کھلاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی ہی دُھن میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اِن کے جیون کا رَس

میٹھے بول بن کر امرت کی صورت میں ٹپکتا ہے، قدم قدم پر اُن کی ہمت بندھاتا ہے۔ اُن کی محنت کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے، اُن کو خوشی اور شانتی کے راستے پر لگاتا ہے اور یوں اُن کی محنت سپھل ہوتی ہے۔ سورج کی کرنیں جس طرح جیون جیوتی کو اُجاگر کرتی ہیں اِسی طرح جھنتا کے گیتوں کی چمک گانے اور سننے والوں کے دلوں میں ہر آن ایک نیا اُجالا لاتی ہیں۔

جھنتا کے گیت اتنے ہی پُرانے ہیں جتنی پُرانی جھنتا ہے۔ لیکن آج بھی جھنتا کے یہ گیت بہت سے دکھوں کا دارو ہیں۔ اِن گیتوں میں کھلے ہوئے آکاش اور دھرتی کی جھلک ہے، گاؤں کے نقشے ہیں۔ ہرے بھرے کھیتوں کی تصویریں ہیں۔ یاروں کی صدا۔ کولہو کی چرخ چوں، چکی کی گھمر گھمر کی گونجیں بھی اس میں شامل ہیں۔ کوئل کی کوک سے سچ مچ ان کے دلوں میں ہوک اٹھتی ہے اور پپیہے کی پی پی سے پیا کی یاد اس طرح تڑپاتی ہے کہ آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ جھنتا کے اِن گیتوں کو سن کر ہم بڑی بڑی بستیوں کے ڈھول ڈھمکوں سے دور اُن دیہاتوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں آس پاس خوبصورت کھلونا سے گاؤں ہزاروں نر ناریوں سے آباد ہیں۔ اُن کی دیہاتی زندگی۔ خانگی معاشرت اور رسم و رواج کا نقشہ ہو بہو ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ درحقیقت گیت حسن و جمال، عشق و محبت اور زندگی کے اُتار و چڑھاؤ کے ایسے موتی ہیں جو سچے اور آبدار ہیں اور ہماری بے پروائی سے خاک میں ملتے جاتے ہیں۔ اگر نیچرل شاعری نام ہے محض اصل

واقعات کو ہو بہو پیش کرنے کا تو پھر کس کی مجال ہے جو اِن دیہاتی گیتوں کے واقعی ہونے میں ذرا بھی شبہ کرے۔ دراصل دیہاتی شاعری جنتا کے سنگیت، شاعری کی روح اور آرٹ کی جان ہیں جو کبھی فنا نہیں ہو سکتے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے اکثر شاعروں کو اِس کی ہوا چھو کر بھی نہیں لگی۔

جنتا کے گیتوں کی بہت سی قسمیں اور مختلف نام ہیں۔ جو اپنے اپنے محل اور موقع پر مختلف طریقوں سے گائے جاتے ہیں۔ اِن گیتوں میں وہ خانگی گیت بھی شامل ہیں جنکو گھریلو ڈومنیاں عورتوں کے روبرو مٹک مٹک کر بے تکلّف گاتی ہیں۔ ہر چند کہ وہ دیہاتی زندگی کے ترجمان نہیں۔ لیکن وہ شہر اور دیہات میں پیدائش کے موقعہ سے لے کر شادی بیاہ کی تقاریب تک میں یکساں طور پر گائے جاتے ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی قدر عُریانی لئے ہوئے ہیں۔ اور اُنھیں گھر کی چاردیواری سے باہر نکالنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اِن کے علاوہ باقی گیت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً پیدائش کے کے وقت کے گیتوں میں نوماسے کے گیت جچاگیریاں چھٹی کے گیت اور لوریاں ہیں شادی بیاہ کے گیتوں میں سہاگ گھوڑیاں سیٹھنیاں (یہ سیٹھنیاں وہی عریاں گیت ہیں۔ جن کا اُوپر اشارہ ہو چکا ہے) ریت کے گیت سہرا مبارکباد۔ منڈھا اور نبٹرا وغیرہ ہیں۔ متفرق گیتوں میں جو وقت اور موسم کے لحاظ سے گائے جاتے ہیں۔ تیجن کے گیت۔ ساون کے گیت۔ چکّی کے گیت، کولھو کے گیت۔ مزدوروں کے گیت۔ دھوبیوں کے کھنڈ۔ خیال بازوں کے خیال، سوانگ کے گیت، ٹیسو اور جھانجی کے گیت ہیں۔

اِن گیتوں کی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوستان کے مختلف صوبے اپنی آب و ہوا کے اعتبار سے بالکل جُدا جُدا ہیں، اُن کی بولیاں ٹھولیاں بھی الگ الگ ہیں۔ آب و ہوا کا قدرتی اور لازمی اثر لوگوں کی معاشرت اور تہذیب پر پڑتا ہے۔ اِس لحاظ سے ہر صوبے کے رسم و رواج کے مطابق وہاں کے گیت بھی علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی زبان میں ہیں لیکن اِس کے باوجود دیہاتی گیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد اُردو، ہندی بھاشا ہی میں ایک لطیف اِمتزاج کے ساتھ پائی جاتی ہے جن کو دیہاتی عورتیں اور اُن کے مرد اپنے دلچسپ انداز اور گنوارو لب و لہجے میں بڑی حسُن و خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں

آئیے اب گیتوں کی اُس بھُول بھُلیّاں میں چلیں۔ جن کی دلکش گونجیں جیون کے میلے کا رُوپ بڑھا رہی ہیں۔ ذرا کان لگا کر سنئے فِضا میں ایک دلکش اور سہانی صدا سی گونج رہی ہے، پہلے ہلکی سی ایک آواز سنائی دیتی ہے پھر فوراً ہی وہ کئی آوازوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بَارہ

رام منا لے رام منا لے ہے پیارے رام منا لے
چَل بھی لا رے رام منا لے پیارے رام منا لے
ڈھولے[۱] والے رام منا لے پیارے رام منا لے
کھول دے بھیا کیلی[۲] اور بھر دے سب سنسار
جائے گیاّ ماتا کے میں تو پر ہوں بلہار
جھولا دے جھولا
جھولا رے جھولا

[۱] بیل وا...

[۲] لوہے کا وہ آنکڑا جو ... بیلوں کے جوئے میں ... اٹکا دیا جاتا ہے

سانٹا[1] چھوا دے رام منالے پیارے رام منالے (ڈنڈا[1])
نیر[2] جھلا لے رام منالے پیارے رام منالے (پانی[2])
لیلے[3] والے رام منالے پیارے رام منالے (بیل والا[3])
بلا، چرسیا[4]، بالیا[5] تھاری جگ میں جوڑ (چرس کھینچنے والا[4] — پانی دینے والا[5] — برابری[6])
ہریالی کے ہم نیوتا کون کرے تھاری ہوڑ[6]
جھولا دے جھولا
جھولا رے جھولا

۲

کیلی جوتے کیلیا، بارہ موڑھیو لاتے ہے رے
جوڑی والے، بھرا اُدھر اسا میرا بھیا رام منائیے رے
آہ کروں تو جگ جلے، جنگل بھی جل جائے رے
جیوڑا پاپی نہ جلے وا میں سب کی ہائے سمائے رے
ہے جھولا دیجو جھولا، جھولا

یہ وہ دلکش گیت اور رسیلے بول ہیں جو غریب لاؤ کھینچنے والے کسانوں کی محنت کے بوجھ کو ہلکا کرتے ہیں، کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں۔ گاؤں میں کوٹھے کے کوٹھے اناج سے بھر جاتے ہیں کسان کھیت پر رہتا ہے، گھروالی چکی پیستی ہے اور من ہی من میں اُس کو یاد کرتی ہے جو اُس کے جیون کا ساتھی اور قسمت کا ستارہ ہے

گیت

باگوں[1] ہو کے مست آئیو باگوں میں بیٹھا بگوان[2] (باغ[1] — باغ والا[2])

جب تیرے بگوان کاں گئے تھے نیمبوا توڑی مزیدار ۱ نیمبو
توڑا ہاں توڑا تیرا کیا توڑا گنوار

میری ڈوڈی ہو کے مست آئیو ڈوڈی میں بیٹھا ڈوڈی وان ۲ ڈیوڑھی
جب تیرے ڈوڈی واں کاں گئے تھے لہریا اوڑھا گمنڈے دار ۳ اوڑھنی
اوڑھا ہاں اوڑھا تیرا کیا اوڑھا گنوار
میری رسوئی ہو کے مست آئیو رسوئی میں بیٹھا دیور اور جیٹھ
جب تیرے دیور اور جیٹھ کاں گئے تھے کھائی تھی جلیبی مزیدار
کھائی ہاں کھائی تیرا کیا کھایا گنوار
۴ سیج میری سیجاں ہیں مست آئیو سیجاں میں بیٹھا میرا شیام ۵ خاوند
جب تیرا شیام کاں گیا تھا حویلی چنائی پنکھے دار
چنائی ہاں چنائی تو نے کیا چنایا گنوار

کسان بھی اپنی ستونتی کا دم بھرتا ہے اسے ابھی تک اپنے بیاہ کی باتیں اور رسیلی راتیں یاد ہیں، دل ارمانوں سے بھرا پڑا ہی

ہریانہ

اوڑھ کنواری بھرے تنے بھرتار چاہیے سے
پیہر ہیں کیوں عمر کٹے گھر بار چاہیے سے ۱ میکہ
تیری عمر ہے تھوڑی تیرے سر پہ باندھ دوں موڑی
تیری اور بنڑے کی جوڑی اک سار چاہیے سے
سجا سجایا کمرہ پلنگ نواڑ چاہیے سے
اے تو عرج سنے نہ موری تو کیے کر رہی دیری

۱ اٹھ   توسی اَلَل بچھیری ترُت سوار چاہیے ہے   ۲ ہشیار
بن چابک نہ ڈیگی انٹر تیار چاہیے ہے
بیاہ میں ہوتے بڑے بڑے باجے ڈھول ڈھیرے اور تماشے
ہوتے سونے سوانگ تماشے یہی کا چاہیے ہے
موکو بس دو پیسے کا روزگار چاہیے ہے
پتی بھرتا سنگ ایک پتی کا پیار چاہیے ہے
پیہر میں کیوں عمر کٹے گھر بار چاہیے ہے

یوں کام کاج کرتے دن اور رات گذرتے ہیں، وقت اور موسم بدلتے ہیں۔ موسم کے ساتھ رُت بھی بدلتی ہے۔ ساون آتا ہے، گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، بجلی کوندتی ہے، چھما چھم مینہہ پڑتا ہے۔ کھیتوں جنگلوں اور باغوں میں ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے، مور ناچتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، پپیہا پی پی کی رٹ لگاتا ہے، دل چنچل اُمنگوں سے مچلنے لگتا ہے۔ عورتیں باغوں اور جنگلوں میں جا کر جھولا جھولتی ہیں، ملہار گاتی ہیں، میٹھے سلونے تیل کے پکوان چڑھتے ہیں لیکن جس کے بالم پردیس میں ہوں وہ کیونکر جھولا جھولے اور کس دل سے ملہار گائے اور کس کے لئے پکوان چڑھائے۔ وہ تو پیا کی یاد میں تڑپ رہی ہے، رو رو کر یوں کہتی ہے۔

کروں کون جتن ارے موری سکھی مورے نینوں سے برسے بادریا
چھائی کالی گھٹا، بادل گرجے، چلے ٹھنڈی پون موراجیا ترسے

تھی پیا ملن کی آس، سو پردیس گئے مورے سانوریا
سب سکھیاں جھولے جھول رہیں، میں کھڑی سوچوں پیا تورے آنگن میں
بھر دے مورے رنگیلے من موہن، موری خالی پڑی ہے گاگریا

۲

۱- اوڑھنی موری دھانی چنریا اتر گئے ÷ دھنا باری عمریا نیہر تر سے ۔ گھر والی
۲- عطر بھری سونے کی تھالی میں بھوجن پروسوں ÷ مورا جیون والا بدیسی تر سے ۔ میکہ
ہونی سونے کا گڑوا گنگا جل پانی ÷ مورا گھونگٹ والا بدیسی تر سے
لونگ الائچی کا بیڑا بناؤں ÷ مورا کو بخن والا بدیسی تر سے ۔ کھانے والا
چن چن کلیاں سیجیں بچھاؤں ÷ مورا سوہن والا بدیسی تر سے

گاگریا خالی پڑی ہے اور سیج سونی ہے لیکن گاؤں کی ندی اور نالے ایسے بھرے ہیں کہ اپنے آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ سوچتی ہے کہ بالم کیوں کر پار اتریں گے۔ اِس لئے ندی سے کہتی ہے۔

دھیرے بہو ندیا تو دِھیرے بہو ÷ مورا کنتھا اتر جائے پار، دِھیرے بہو ۔ خاوند
گرج گرج کر بادل برسے بجلی کوندے جی ÷ رات اندھیری جیا ڈرت ہے سونا ہے گھر بار
دِھیرے بہو ندیا تو دِھیرے بہو
کاہے کی توری نیا کاہے کی پتوار ÷ کون تورا نیا کھیویا کے دھن اترو پار ۔ عورت
دھرم میں بنی موری نیا رے ست کی لگی پتوار ÷ سیاں مورا نیا کھیویا مو دھن اتروں پار ۔ سہ
دِھیرے بہو ندیا تو دِھیرے بہو

سہ ۲ ماخوذ از دیہاتی گیت ۳ ماخوذ از ساون کے گیت مطبوعہ رسالہ ادبی دنیا اکتوبر ۱۹۳۲ء

اور جب پیا کے آنے کی خبر ملتی ہے تو اُس کے آنے سے پہلے اپنی سکھیوں کو بلاتی ہے اور بالم کے آنے کی خبر سُناتے ہوئے اُن سے ایک نہایت عجیب اور پیارا سوال کرتی ہے۔

تم آؤری سکھیوں موری میں توسے یُوں پوچھوں
برس پیچھے راجہ آئے میں واسے بولوں یا روٹھوں

دیہاتوں کی یہ منہ چڑھی ندیاں اور سر چڑھے نالے گاؤں کے نر ناریوں اور پتی پتنیوں کو جب ضرورت سے زیادہ پریشان کرتے ہیں تو اُن کی خبر وہ دریا دِل پھیرے لیتے ہیں جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر صبح سویرے گھر سے نکلتے ہیں اور دوسروں کے مزے کی خاطر دریا میں اپنا جال پھینکتے ہیں۔ جال تو پانی میں ڈال دیا لیکن آنکھیں نیلے آکاش پر لگی ہوئی ہیں۔ اور مُنہ سے یہ بول نکل رہے ہیں۔

گیت

آس لگا چلا میں گھر سے جا پہنچا دریا پہ واں
تڑپ رہی دریا میں مچھلی جیسے دشمن تڑپے یاں
جوں پانی میں ڈالا جال، مچھلی کے پھنس کے کر رہی بل
دائیں سے بائیں کو نکل، جا جال کے اندر گئی وہ رَل
بسم اللہ کر میں نے غوطہ مارا مچھلی کو جا دیا مَسل
گردن پکڑ باہر میں لایا دیکھ کے دشمن ہو گیا دنگ
گھیر لیا گھیرے میں، ہیں نے دریا کی مچھلی کو واں
جال ہاتھ سے دیا ڈال اور ڈگن ہاتھ میں لئے سنبھال نہ چھڑ
پہلے نام اُستاد کا لیا اور ڈگن کو میں نے دیا بجا

تین تین میل کی مچھلی ایکدم میں سے نے واں لی بُلا
مار مار کے بوری بھر دی، بھیجدی گذری[1] کے ہاں — [1] منڈی
تڑپ رہی دریا میں مچھلی جیسے دشمن تڑپے یاں
دوسرے دن پھر پہنچا دریا اور ہزارہ دیا لگا
جگہ جگہ لگھی[2] بوئیں اور ٹیشش کے گولے[3] دئے لگا — [2] چھڑ — [3] لوہے کے وہ گولے جو جال کو پانی میں ڈبوئے رکھتے ہیں۔
بارہ بجے جب رات کو دریا اندر پہونچا واں
بڑے بڑے سنگھاڑے سول اور ملّی واں سے لایا چھڑا
اور عبدالغنی گیانی جھنڈا نے خیال بنا کے دیا سُنا
تڑپ رہی دریا میں مچھلی جیسے دشمن تڑپے یاں

اچھے یہ چلے جال سکھی رہی ؛ خوب کٹا یہ سال سکھی رہی
گچھے بُنے ڈوری منگوائی ؛ بعد میں اُس کے چک ہوائی
سن[1] کی ڈوری ہیم بی سٹیل[2] منگوائی ؛ بعد میں وونٹ کی جالی بنوائی — [1] سن کی ڈوری — [2] سُوت کی ڈوری

٢

دہلی گئے اور گئے کانپور ؛ بارہ بنکی اور گئے رامپور
باون بستی گئے سانپور ؛ اور ڈھیر آ کے لگا دھام پور
چرخوں پہ آرہی بہار ؛ سکھی رہی خوب کٹا یہ سال

٣

کالے دوپٹے من کو بھاتے ؛ میرٹھ سے چھپوا کر لاتے
کوئی اُودا کوئی سبز لگاتے ؛ کوئی دھانی کوئی نارنجی لاتے
ہو گئے سب خوش حال ؛ سکھی رہی خوب کٹا یہ سال

۴

بریانی پلاؤ ڈھیر منگایا * زردہ متنجن خوب اُڑایا
دال چھنال کو کس نے پکایا * دو مرغی کے انڈے لایا
مرغے کٹے دو چار * سکھی ری خوب کٹا یہ سال

۵

سو سو روپے کا ہار بنایا * گھر والی کو جا کر پہنایا
غنی حسینی نے گا کر سنایا * مصرع نہ کوئی جھوٹ لگایا
جھنڈا نے کیا تیّار * سکھی ری خوب کٹا یہ سال

دریا کے کنارے دھوبیوں کے گھاٹ ہیں، اِدھر اُدھر سینکڑوں دُھلے دُھلائے اُجلے کپڑے دھوپ میں پڑے سوکھ رہے ہیں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کمر جھکائے کپڑے دھونے میں مصروف ہیں، اِن کا سخت کام دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ شاید اِن کے جیون میں رَس کی کمی ہے لیکن یہ ہماری بھول ہے، اِن کا جیون بھی پیار سے بھرپُور ہے۔ اِن کے جیون میں بھی رسیلے نین، اَٹکھیلی چتونیں اور گوری گوری بنیاں ہیں، کپڑے دُھونے کے ساتھ راگ رنگ اور چھیڑ چھاڑ میں بھی مصروف ہیں۔

۱

گوری گوری بنیاں گُدائے گدنا * ریشم کی چولی کسائے جُبنا

۲

تو کھالے اِلائچی دانا * اور ہمیں بریلی جانا

۳

توپ خانے کی دھوبن بڑی موٹی ❊ لہنگے میں چھپالائی ڈبل روٹی

۴

نئی نوکری دو گنا چاؤ ❊ اُٹھ ری دھوبن کلپ بناؤ

اور یہی چھیڑ چھاڑ کی باتیں کبھی کبھی اِن کے گیتوں میں ایک پریم کہانی کا رنگ بھر دیتی ہے۔

نئی ہر واسے مورا من ہر گیو ری

ایکدن جھنکو بھی میں ٹھاڑی آنگنواں میں

جب دِن تھوڑے سے رہ گئے گونواں[۱] میں ۔۔۔ [۱] رخصتی

کھلبلی پڑ گئی مورے بالے سے جوبن واں میں

پیاں کی صورت بس گئی مورے پرنٹ واں میں ۔۔۔ [۲] روئیں روئیں میں

اے جی دُکھ سُکھ دل سے بسر گئیو ری

پیا کی چھب ڈھب گڑ گئی موری نظریا میں

اٹھوں میں چونک چونک رات جو اندھیریا میں

ٹپ ٹپ آنسو چوئے نین سے چندریا میں

پیت دھوکے سے کرکے مُکر گیا ری

کیسے سوچ یونہی پڑی پڑی ہاتے سُونی سیجریا میں

کہو کبھی کی آج موہے بھائے نہیں بتیا جی

جب سے دیکھی ہے میں نے بلم کی صورتیا جی

آٹھوے ہے یا داور دھڑکے ہے موری چھتیا جی
نہ جانوں گاؤں ٹھاؤں کیسے بھیجوں پتیا جی

تیرے عسکوں میں تن من سب ہوگیو ری

۷۔ بھینٹ

کہتے چھنگا چنچل ہوئی ہے یہ ناری جی
پہلے سے سُدھ بُدھ کیوں پیتم کی بساری جی
دیا جوالا پہ کرتے ہیں مُراری جی
یہ سب مایا دنیا پہ ہے تمہاری جی
نئی ہروا سے مورا من ہر گیوری

اور یوں گاتے گاتے کھیل ہی کھیل میں اپنا کام کئے جاتے ہیں، سارا دن گھاٹ پر رہتے ہیں، رات پڑے گھر جاتے ہیں، دن بھر کے کام کاج کی تھکن کھنڈوں کی محفل میں کھنڈ گا گا کر اُتارتے ہیں

کھنڈ

پڑا آنکھ پر پردہ اِن آفتوں کو کوئی شعور نہ تھا
اَنا الحق منصور کہے جب شرع کو یہ منظور نہ تھا
خدا نام کا پیالہ پیا کسی اور نشے میں چُور نہ تھا
گھٹ میں اُس کے بول رہا وہ پاس رہا کوئی دُور تھا
بن مرضی مُرشد کی اے جو سُولی پہ چڑھا منصور نہ تھا
بن مرضی مولیٰ کی اے جو موسیٰ کو ملا کوہ طور نہ تھا
گُرو لاہوری نے کتھا گیانی منصور کے پاؤں کا دھُور تھا

جنتا کے بہت سے گیت آپ نے گاؤں کی خاموش اور پُرسکون فضا میں سُنے، اب انہی گیتوں کی ایک آخری گونج اپنے شہر میں چل کر سنیئے۔ گاؤں کے وہ غریب جن کے پاس نہ اناج بونے کے لئے زمین ہے اور نہ کوئی دوسرا کام ہے وہ صبح ہوتے ہی پیاز کی دو تین گنٹھیاں اور روٹی کے تین چار موٹے موٹے ٹکڑے کپڑے میں باندھ کر کام کی فکر میں شہر روانہ ہو جاتے ہیں۔ دو چار اِدھر دو چار اُدھر، دو چار کسی اور طرف، شہر پہنچ کر وہ پہاڑ کاٹتے ہیں، کانیں کھودتے ہیں، نہریں بہاتے ہیں، پُل تیار کرتے ہیں سڑکیں نکالتے ہیں، قلعے کھڑے کرتے ہیں، مسجد، مندر، محل، حویلی مکان اور سرائے بناتے ہیں، باغ باغیچے لگاتے ہیں اور یوں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال لیتے ہیں۔ اور جب اُنھیں اپنا کام بہت بوجھل محسوس ہوتا ہے تو اُس کٹھن سمے میں اُنھیں کے گیت اُنھیں سہارا دیتے ہیں۔

اُدھر دیکھئے ایک راجہ جی کا محل تیار ہو رہا ہے، سینکڑوں مَن کا ایک آہنی شہتیر اوپر کی منزل پر لے جا رہے ہیں، ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگ رہا ہے، سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہیں لیکن "ہی یا ہی یا" کر کے کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچ ہی جائیں گے

ہی یا ہی یا[1]

گاڈر لینا	کیسے بھائی	بوجھ اٹھا لو بوجھ اٹھایا
ایسے بھائی	ہیّا ہیّا	محل ہمارا کا ہاں ہاں بھائی

---

[1] ماخوذ از مضمون سید مطلبی فریدآبادی مطبوعہ چنگاری، دہلی

محل سہرا کا　　ہاں ہاں بھائی
بوجھ اٹھالو　　بوجھ اٹھایا
اونچا کرلو　　ہیّا ہیّا
بوجھ اٹھالو　　ہیّا ہیّا
بوجھ اُٹھایا　　ہیّا ہیّا

ہاتھ بجا کے　　ہاں ہاں بھائی
پیر بجا کے　　ہاں ہاں بھائی
بوجھ اٹھالو　　بوجھ اٹھایا
اونچا کرلو　　ہیّا ہیّا
شیر بہادر　　ہیّا ہیّا
اونچا کرلو　　محل سہرا
بوجھ اٹھالو　　بوجھ اٹھایا
کیسے بھائی　　ہیّا ہیّا
شیر بہادر　　ہیّا ہیّا
آگے مَر کے　　ہیّا ہیّا
شیر بہادر　　ہیّا ہیّا
ہاں ہاں بھائی　　ہیّا ہیّا
پیٹ پلیگا　　تھارا تھارا

باغ بنے گا　　ہاں ہاں بھائی
پھول کھلیں گے　　ہاں ہاں بھائی
جشن اُڑیں گے　　ہاں ہاں بھائی
پیٹ پلے گا　　چار مہینے
پیٹ پلے گا　　تھارا تھارا
تھارا تھارا　　تھارا تھارا
ہاں ہاں بھائی　　تھارا تھارا
پیٹ پلیگا　　چار مہینے
ہاں ہاں بھائی　　ہیّا ہیّا
شیر بہادر　　ہیّا ہیّا
کیسے بھائی　　ہیّا ہیّا
پیٹ پلیگا　　ہیّا ہیّا

اور اٹھاؤ　　ہیّا ہیّا
آگے مَر کے　　ہیّا ہیّا
آٹھ مہینے　　بھوک لگے گی
شیر بہادر　　بھوک لگے گی
بن کپڑے کے　　بن لتّے کے
آٹھ مہینے　　بن روٹی کے
زور لگاؤ　　ہیّا ہیّا
بھوک لگیگی　　بھوک لگے گی
کیسے بھائی　　ہیّا ہیّا

شیر بہادر ہیا ہیا	دام ملیں گے ہیا ہیا
ہاں ہاں بھائی ہیا ہیا	سود بھریں گے ہیا ہیا
پیٹ بھرے گا ہیا ہیا	قرض ملے گا ہیا ہیا
اور اُبھارو ہیا ہیا	شیر بہادر ہیا ہیا
ہاتھ بچا کے ہیا ہیا	اور ابھارو ہیا ہیا
شیر بہادر ہیا ہیا	پیر بچا کے ہیا ہیا

۲

سوکھی رے لکڑی جنگل کی	اللہ ہی اللہ بولو جوانو
نام تو لیتی اللہ کا	نام تو لیتی اللہ کا
اللہ ہی عالم کل جو معلوم	تم رے زوروں عدو چلے
نام تو لیتی اللہ کا	نام تو لیتی اللہ کا
بولو جوانو! ہتنسا	بولو جوانو! ہتنسا
اللہ ہی ڈالو زور لگالو	گوری کا گونا بل کر دونا۔
نام تو لیتی اللہ کا	دونا ہی زور لگاؤ جوانو
جو رم جوری ناچے گوری	جواناں بنگی مست ہے بھنگی
نام تو لیتی اللہ کا	بھنگ کا کھانا موج اُڑانا
بولو جوانو ہتنسا	نام تو لیتی اللہ کا

اور بولو جوانو، زور سے بولو ہتنسا

غرض راجہ اپنی دُھن میں ہے اور پرجا اپنی دُھن میں، اپنے گیتوں کی بھول بھلیاں میں کھوئی ہوئی اور اپنی محنت سے دوسروں کو سہارا دیتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی ہے بڑھتی جارہی ہے، بڑھتی جارہی ہے ؛

اسی مصنّف کی دوسری کتابیں

یہ دِلّی ہے اِن مضامین میں پُرانی دِلّی کی اُس زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے جو سطح پر ظاہر ہونیوالے ملکی واقعات اور سیاسی حوادث کی اندرونی گہرائیوں میں پرورش پاتے اور گل بوٹے کھلاتے رہے، یہ تمدنی مطلعے دلچسپ بھی ہیں اور دل افروز بھی اور ان سے ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی آثار کو جاننے اور سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ دو روپے

جھلکیاں زندگی کی چودہ جھلکیاں اپنی تمام تر تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ افسانوں کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ دو روپے

موتی مشرق و مغرب کے علمار اُدبا اور فلاسفہ کے حکیمانہ اور شاعرانہ اقوال کا مجموعہ، اقوال کے فلسفہ و تاریخ کی روشنی میں محکمۂ تعلیمات حیدر آباد دکن اور ریاست کشمیر سے منظور شدہ ایک روپیہ

زیرِ طبع

غالب کی دِلّی

آئینۂ غالب

دِلّی کے کھیل

مطبوعات مکتبہ جہاں نما

تصانیف اختر انصاری

خندۂ سحر اختر انصاری کے شعری کارناموں کے دو حصے یعنی غزلیں اور قطعات مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، اس سلسلہ کی تیسری اور سب سے اہم کڑی اختر کی نظمیں ہیں، غنائی، محاکاتی اور وصفیہ نظموں کا یہ مجموعۂ فکر احساس کی بیشمار نزاکتوں اور رنگینیوں کا مرقع ہے جو اپنی تاریخی اہمیت اور فنی حسن و عظمت کے لحاظ سے غیر معمولی مرتبہ کی چیز ہے — ڈیڑھ روپیہ

نازو حسن و عشق اور حیات و موت کی چودہ لطیف و رنگین داستانوں کا مجموعہ۔ — ڈیڑھ روپیہ

اندھی دنیا ۲۳ - ترقی پسند افسانوں کا مجموعہ ہے، یہ کہانیاں جدید افسانوی ادب کے بنیادی کارنامے ہیں — سوا روپیہ

نغمۂ روح ابتدائی کلام — ایک روپیہ

تلخ و شیریں (از صلاح الدین صاحب قریشی) ایک حساس دل و دماغ زندگی کی تلخی و شیرینی سے متاثر ہو کر جو دردناک چیخ یا پر مسرت قہقہہ لگاتا ہے یہ افسانے اسی احساس و تاثر کی تفسیر ہیں۔ — دو روپے

قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں (از عرش صاحب تیموری) قلعۂ معلیٰ کے دلچسپ حالات، مغل عہد حکومت اور زمانۂ غدر کی مستند تاریخ۔ — آٹھ آنے